سہیل عظیم آبادی

"........موجودہ نظام زندگی نے غریبوں اور امیروں کے طبقوں کے درمیان جو لکیر کھینچ دی ہے، وہ صوبہ بہار میں اسقدر صاف، واضح اور متعین ہے کہ شاید اوڑیسہ کے جنگلوں کو چھوڑ کر ہندوستان کے کسی دوسرے صوبے میں اسکی نظیر مشکل ہی سے مل سکے......

........قدرت کی تقسیم دولت غیر منصفانہ ہے۔ انسانی سماج دو قطبوں میں بٹ جاتا ہے۔ ایک قطب پر قدرت کی تمامتر دولتیں، انسانی زندگی کی رنگینیاں اور سہولتیں جمع ہو جاتی ہیں، اور دوسرے قطب میں زندگانی کی کل پریشانیاں، مصیبتیں اور تکلیفیں، غریبوں اور امیروں میں جو ما بعد القطبین ہے اسکی واضح مثال آپ کو بہار کی سماجی زندگی میں ملیگی اور یا سہیل کے اِن افسانوں میں جو اسی زندگی سے متعلق ہیں!

(کرشن چندر)

۱/۸/-

الاؤ

سہیل عظیم آبادی

مکتبۂ اردو لاہور

طبع اوّل ——— قیمت عہ

مرکنٹائل پریس لاہور میں چودھری نذیر احمد پرنٹر پبلشر کے اہتمام سے چھپ کر مکتبہ اُردو لاہور سے شائع ہوئی

اِنتساب

اپنے مخدوم اور محترم بزرگ ڈاکٹر عبدالحق صاحب قبلہ کے نام. جن کی زندگی کا ہر لمحہ اُردو زبان و ادب کی ترقی اور بہبودی کی فکر میں صرف ہوتا ہے ؛

سہیل عظیم آبادی

فہرس

تعارف

سہیل بہار کے رہنے والے ہیں، وہ بہار جہاں کے قحط اور زلزلے مشہور ہیں۔ صوبۂ بہار میں قیمتی معدنیات کی فراوانی ہے، جنگل بھی بے شمار ہیں۔ جہاں سے انگریزی صوبجات کے لئے خام پیداوار مہیا کی جاتی ہے۔ کوئلے اور لوہے کی کانوں کے سب سے بڑے ذخیرے ہیں زمین بھی زرخیز ہے۔ دھان بکثرت پیدا ہوتا ہے بہار کی لیچی، امرود، اور آم ہندوستان بھر میں مشہور ہیں۔ ان تمام باتوں سے بظاہر یہی اندازہ لگ سکتا ہے، کہ قدرت کی اس غیر معمولی فیاضی کے طفیل بہاریوں کو زندگی کی بیشتر خوشیاں نصیب ہوں گی اور وہ ان تمام معاشی اور اقتصادی صعوبتوں سے آزاد ہوں گے کہ جن کا شکار آئے دن ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے لوگ ہوتے رہتے ہیں۔

لیکن بہار کی جنتا کی زندگی ہر قدم پر اپنے جغرافی ماحول کی تکذیب کرتی ہے، مجھے بہار کے دیہات میں چند ماہ بسر کرنے کا اتفاق ہوا ہے اور میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ افلاس اور نکبت کے وہ منظر جو میں نے بہار میں دیکھے ہیں وہ اس قدر خوفناک اور

گھناؤنے تھے کہ اب تک اُن کی یاد بدن کے رونگٹے کھڑے کر دیتی ہے۔ امارت اور غربت کا ظالمانہ تضاد وہاں اس خطرناک حد تک بڑھا ہوا ہے کہ کوئی وجہ صلح باقی نہیں۔ موجودہ نظامِ زندگی نے غریبوں اور امیروں کے طبقوں کے درمیان جو لکیر کھینچدی ہے وہ صوبہ بہار میں اس قدر صاف واضح اور متعین ہے کہ شاید اوڑیسہ کے جنگلوں کو چھوڑ کر ہندوستان کے کسی دوسرے صوبے میں اس کی نظیر مشکل ہی سے مل سکے۔ وجہ یہ ہے کہ گو قدرت جغرافیہ بناتی ہے انسان سماجی قانون بناتا ہے اور دو ہزار سال کی پیہم کوششوں کے بعد بھی تہذیب انسان کی بربریت، وحشت اور کمینگی کو دور نہیں کر سکی، اسی لئے تو سماجی قانون جغرافی ماحول پر حاوی ہو جاتے ہیں، قدرت کی دولت کی غیر منصفانہ تقسیم ہوتی رہتی ہے۔ انسانی سماج دو قطبوں میں بٹ جاتا ہے، ایک قطب پر قدرت کی تمام تر دولتیں انسانی زندگی کی رنگینیاں اور سہولتیں جمع ہو جاتی ہیں۔ اور دوسرے قطب میں زندگی کی کل پریشانیاں، مصیبتیں اور تکلیفیں غریبوں اور امیروں میں جو بعد القطبین ہے۔ اس کی ایک واضح مثال آپ کو بہار کی سماجی زندگی میں ملے گی۔ اور یا سہیل کے اِن افسانوں میں جو اسی زندگی سے متعلق ہیں۔

سہیل نے ان دونوں طبقوں کی آویزش کو فنی خوبصورتی اور دیانتداری سے اجاگر کیا ہے، اگر طاقتور طبقے کے مظالم کو بے نقاب کیا ہے تو کسانوں اور مزدوروں کی کمزوریوں پر بھی پردہ نہیں ڈالا، اِسی فنی صداقت کے باوجود ان کی ہمدردی مزدوروں اور کسانوں کے ساتھ ہے۔ یہ اس لئے کہ موجودہ نظامِ زندگی میں ایک حساس اور دردمند فرد کے سامنے

اور کوئی زاویۂ نگاہ نہیں ہو سکتا، سہیل کے افسانوں میں ہمیں بہار کے کسان اور اُس کی زندگی کے مسائل اپنی تمام تر صعوبتوں اور خوشیوں کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ سہیل نے ان لوگوں کی زندگیوں کا نظرِ غائر مطالعہ کیا ہے، اُن کی طنز گہری ہے، فنی ادراک صحیح اور متناسب، وہ جذبات کے دھارے میں نہیں بہہ جاتے، بلکہ جذبات پر قابو پاکر لکھتے ہیں۔ اور افسانے کے اختتام پر ایسی گہری چوٹ کرتے ہیں، کہ اس کا اثر دیر تک قائم رہتا ہے، موضوع کی وحدانیت، ایک مضبوط پلاٹ سے ہم آہنگ ہو کر ایک خوبصورت افسانے کا تانا بانا تیار کر دیتی ہے۔ خوبصورت افسانہ میں نے اس لئے کہا۔ کہ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ کسانوں اور مزدوروں کی زندگی کے متعلق کبھی کوئی خوبصورت افسانہ لکھا ہی نہیں جا سکتا؛ بالفاظ دیگر خوبصورت افسانہ وہی ہے۔ جس میں رنگا رنگ ساریوں، شمپین کی بوتلوں اور کسی کے ہلتے ہوئے طلائی آویزوں، کا بار بار ذکر ہو، سہیل کے ہاں ان چیزوں کا ذکر بہت کم ہے، شاید اس لئے کہ انفرادی اور سماجی خوبصورتی کے متعلق بھی اُن کا نظریہ مختلف ہے۔ وہ خوبصورتی کو ایک اضافی قدر سمجھتے ہیں۔ ایک ایسی قدر جو ماحول اور سماج اور قدرت کی پیکار کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے۔

سہیل کے افسانوں میں درمیانی طبقے کی زندگی کا بہت کم ذکر ہے۔ اس لئے کہ بہار میں یہ طبقہ یعنی سہیل کا طبقہ قریباً قریباً ناپید ہے، اور اس کے افراد انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں، صوبۂ پنجاب یا بمبئی کی طرح بہار میں کوئی ایسا قوی درمیانی طبقہ نہیں، جو امیروں سے ٹکر لینے کی سکت رکھتا ہو، یا جس کا خیال سب سے اونچے طبقے

کو خائف کرتا ہے۔ اور اُسے کبھی درمیانی طبقے سے کبھی کسانوں اور مزدوروں کے نچلے طبقے سے وقتی مفاہمت کے لئے مجبور کرتا ہے۔ نہ ہی پنجاب کے کسانوں کی طرح بہار کے کسان اپنی زمینوں کے خود مالک ہیں۔ ان تمام امور نے سہیل کے ذہن اور اُس کے اندازِ تفکر کو اُن تمام نیم بورژوائی اور ۔ ۔ ۔ میلانات سے بچائے رکھا ہے جن میں ہمارے بیشتر ادبی اذہان الجھ کر رہ جاتے ہیں۔

سہیل بہاری سماج میں اصلاح کے قائل معلوم نہیں ہوتے۔ اُن کا نقطۂ نظر اصلاحی نہیں رہا۔ انقلابی بن گیا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ یہ سماج اب اصلاح کے قابل نہیں اسے ڈھا دینا ہے جس سماج میں کسانوں کی زبوں حالت کا یہ نقشہ ہو۔ کہ بدن پر صرف ایک پھٹی سی دھوتی ہے۔ گھر میں عورتیں نیم عریاں' اکثر حالتوں میں ہمارے گھر کی عورتوں کے لئے ایک لہنگا ہوتا ہے۔ جسے وہ باہر جانے کے لئے باری باری پہن لیتی ہیں۔ بچے ننگ دھڑنگ پھرتے ہیں' کھانے کے لئے چاول' اور اکثر حالتوں میں چاول بھی نہیں ملتے۔ اور سالن کے لئے وہ زیرِ آب کائی جو جوہڑوں اور دھان کے کھیتوں میں پائی جاتی ہے۔ بتائیے اِس زندگی میں اصلاح کی کیا گنجائش ہے۔

پرانے سماج کو کس طرح گرا دیا جائے اور نئے سماج کی تعمیر کس نہج پر ہو۔ اس کے متعلق سہیل نے ابھی تک کوئی واضح راہ متعین نہیں کی۔ لیکن یہ راہ شاید ابھی دوسرے ادیبوں کی تحریروں میں بھی نظر نہیں آتی۔ ناامیدی بے چارگی اور پیہم ناکامی کا تلخ احساس جو بہاری کسان اپنی زندگی میں بار بار محسوس کرتا ہے۔ سہیل کی تحریرات میں اکثر جھلکتا ہے

کسان کی زندگی ایک کاغذ کی ناؤ ہے۔ امیر کی مضبوط کشتی نہیں"۔ غریب کی زندگی کیا ہے۔ کاغذ کی ناؤ ہے جب تک تیرتی رہی تیرتی رہی، ہوا کا ایک جھونکا آیا، اُلٹی اور ڈوب گئی" اُن کے اکثر افسانوں میں یہی رنگ تفکر ہے۔ یہی صدائے احتجاج ہے"۔ الاؤ، چوکیدار، بخیر تمام، پیٹ کی آگ، اسی ذہن کی تخلیق ہیں۔ ہاں، "دو مزدور" میں سہیل ہمیں پہلی مرتبہ مزدور کے اُسی عزم راسخ کا اتا پتا بتاتے ہیں۔ جس نے ہندوستان ہیں کیا دنیا بھر میں مزدور کو نئی تعمیر کا مرکز بنا دیا ہے۔

سہیل کی زبان نہایت سادہ اور سلیس ہے، مصنوعی اور غیر فطری مکالمے کہیں نہیں ہیں، ہماری گاؤں اور اُس کے افراد کی تصویر اس فنی صناعی اور چابکدستی سے کھینچتے ہیں کہ افسانے کی دلکشی دوبالا ہو جاتی ہے۔ غیر ضروری الفاظ کے استعمال سے بہت پرہیز کرتے ہیں۔ اپنی تحریرات میں کم گو لیکن پُر گو ہیں، بہت کچھ نہ کہکر بھی بہت کچھ کہدیتے ہیں۔ اسے اُن کے انداز تحریر کا اعجاز سمجھنا چاہیے۔

کرشن چندر

دہلی۔۔ ۳۰ر جون ۱۹۴۲ء

الاؤ

گاؤں سے پورب ایک بڑا سا میدان ہے کھیت کی سطح سے کچھ اونچا اور چوڑس۔ لوگ کہتے ہیں کہ پرانے زمانے میں کسی راجہ کا یہاں پر راج محل تھا۔ اُسی کی مٹی اور اینٹ سے زمین اونچی ہوگئی ہے۔ میدان کے پوربی کنارے پر پیپل اور برگد کے پیڑ ہیں اور اُس کے بعد کھیت، اتر طرف ناگ پھنی کی گھنی اور لمبی قطار ہے۔ اس کے بیچ بیچ میں کوئی نیم یا پاکڑ کے پیڑ، اور اُس کے بعد کھیت۔ دکھن میں ایک کنارے پر ایک پیپل کا پیڑ ہے، اسکے پاس ہی ایک کنواں پھر کھیت۔ پورب دکھن کونے پر ایک بڑا سا گڈھا ہے۔ جس میں برسات کا پانی جمع ہو کر کئی مہینے رہا کرتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ راج محل کا یہ پوکھر تھا۔ اس میں رانی اپنی سہیلیوں کے ساتھ نہایا کرتی تھی۔ نہلانے سے پہلے پوکھر میں گلاب کا عرق ڈالدیا جاتا تھا، جس کی

مہک دُور دُور تک پھیل جاتی تھی۔ چاندنی راتوں میں راجہ اور رانی دونوں ناؤ پر اس پوکھر میں سیر کیا کرتے تھے۔ یہ پوکھر بہت بڑا تھا۔ بھرتے بھرتے بھر گیا اور جو نشان باقی رہ گیا ہے وہ بھی راجہ اور راج محل کی طرح مٹ جائیگا۔

گاؤں میں اب کسان ہی کسان رہتے ہیں۔ پرجا ہی پرجا —— راجہ کو مرے برباد ہوئے تو زمانہ بیت گیا، اُس کا راج محل تو میدان ہے۔

یہ میدان گاؤں والوں کے لئے سب کچھ ہے۔ ہر روز سارے گاؤں کے ڈھور اس میدان میں جمع ہوتے ہیں۔ لوگ اپنی اپنی بھینسوں کو کنوئیں پر دھوتے ہیں۔ پھر گھر لے جاتے ہیں فصل کٹنے پر کھلیان لگاتے ہیں۔ روکھ پیڑنے کو کولھو بٹھاتے اور گو بہ سار بناتے ہیں۔ گاؤں کے لڑکے صبح سے شام تک کھیلتے اور بڑے بوڑھے کسی پیڑ کے نیچے بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔

کاتک کا مہینہ تھا۔ ٹھنڈک اچھی خاصی پڑنے لگی تھی اور میدان میں کتنی دھان کا کھلیان لگایا جانے لگا تھا۔ گاؤں میں نئی زندگی پھیلی ہوتی تھی۔

کچھ لڑکے میدان میں کبڈی کھیل رہے تھے۔ عورتیں کنوئیں سے پانی بھر کر اپنے گھروں کو لیجا رہی تھیں۔ بھگو اپورب کی طرف آگ جلا کر اپنی لاٹھی کو سینک کر سیدھی کر رہا تھا۔ اُسی دن وہ اپنی بہن کے گھر دھرم پور سے آیا تھا۔ بہنوئی نے چلتے وقت یہ لاٹھی اپنی بسواڑی میں سے کاٹ کر دی تھی۔ لاٹھی بیچ کی طرف سے ذرا ٹیڑھی تھی۔ اس کا سیدھا کرنا ضروری تھا۔

بھگّو نے لاٹھی سیدھی کرنے کو الاؤ جلا رکھا تھا۔ وہ پہلے لاٹھی کو سینک کر پیپل کی جڑ میں پھنسا کر اُسے سیدھا کر رہا تھا۔ وہ اپنی بہن کے یہاں سے ایک گیت سیکھ کر آیا تھا۔ اُس گیت کو ہلکے ہلکے سُروں میں گاتا جاتا تھا۔ ساتھ ہی اُس کے دماغ میں بہت سی باتیں گھوم رہی تھیں۔ سب سے زیادہ یہ کہ گاؤں میں ایک بہت بڑی سبھا ہونی چاہیے۔ ٹھیک ویسی ہی یا اُس سے بھی بڑی جیسی اُس کی بہن کی سسرال میں ہوئی تھی۔ اور سبھا میں وہ کھڑا ہو کر کل لوگوں کو ساری باتیں سمجھائے۔ جیسے وہاں ایک آدمی نے سمجھایا تھا۔

بھگّو اپنے خیالوں میں مگن تھا کہ اکلو آگیا۔ یہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ اور گاؤں کے ناتے میں بھگّو کا چچا تھا۔ اکلو نے آتے ہی کہا۔

"بیٹا! لاٹھی تو اچھی ہے۔ مگر اس میں گڑا سا لگے تب۔"

بھگّو نے پلٹ کر دیکھا اور بولا۔

"ہاں چچا۔ پر گڑاسا اچھا سا مل جائے تب نا۔"

شام ہو چکی تھی، دھیرے دھیرے اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ لاٹھی سیدھی ہو چکی تھی۔ اُس نے خوب گھما گھما کر لاٹھی کو دیکھا۔ پھر پیپل کے پیڑ کے سہارے پر کھڑا کر کے دو قدم پیچھے ہٹ کر دیکھنے لگا۔ اکلو بھی لاٹھی کو ایک خاص نظر سے دیکھتا رہا۔ جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ لاٹھی اچھی ہے۔ اور اگر مل جائے تو بہت اچھا ہو۔

ابھی لاٹھی کو یہ دونوں دیکھ ہی رہے تھے کہ ساموا اور باڑھو بھی گھومتے پھرتے آگئے باڑھو نے آتے ہی کہا۔

"ارے بھیّا! ابھی اتنا جاڑا تو نہیں پڑتا۔ ابھی سے الاؤ تاپنے لگے۔"

اکلو بولا۔

"بھاگو اپنی لاٹھی سیدھی کر رہا تھا۔ الاؤ کون تاپے گا ابھی۔"

باڑھو بولا۔

"مگر آگ بھلی معلوم ہوتی ہے بھائی۔"

یہ کہتا ہوا وہ آگ کے پاس بیٹھ گیا اور تاپنے لگا۔ اس کے بیٹھتے ہی اور لوگ بھی بیٹھ گئے۔ ساونل اسی طرف آ رہا تھا اور ان لوگوں کی باتیں سن چکا تھا۔ وہ آتے ہی بولا۔

"واہ! باڑھو چچا پہلے تو دوسرے کو ٹوکا اور سب سے پہلے ہی بیٹھے بھی آگ تاپنے۔ واہ۔"

باڑھو بولا۔

"ہاں بیٹا! اب آگ بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اور ہم نے ٹوکا کب تھا۔ ارے ایسے ہی بول رہا تھا۔"

سب کے سب آگ تاپنے لگے۔ آگ ابھی زیادہ تھی۔ اس لیے کچھ دور ہی دور بیٹھے باڑھو نے پاؤں پھیلاتے ہوئے کہا۔

"ارے یہ لونڈے سب اتنے بدمعاش ہوتے جا رہے ہیں کہ کیا کہا جائے۔"

ساونل نے کہا

"کیا چچا، ہم لوگوں نے تو کوئی بدمعاشی نہیں کی۔"

باڑھو بولا۔

"نہیں تم سب کی بات نہیں۔ یہی تو میرا کہنا ہے تم سب جوان اور بال بچے والے ہوئے کبھی کوئی اونچی نیچی بات دیکھنے سننے میں نہ آئی۔ پر اب کی تو دنیا ہی بدلتی جا رہی ہے دیکھو ابھی راستے میں آ رہے تھے تو دیکھا کہ چھپی اور چھپیدو کے دونوں لڑکے ریڑ (ارنڈ) کی ڈنٹھل جلا کر بیڑی کی طرح بھک بھک کھینچ کر دھواں اڑا رہے ہیں۔ ڈانٹا تو دونوں کھانستے ہوئے بھاگے۔ سب کا کلیجہ جل جائیگا۔"

اتنے میں چھپی آگیا، اور باڑھو نے اس سے بھی یہ بات دہرادی۔ لیکن چھپی نے کہا۔

"بھیا۔ اب اوجھا تاہی نہ رہا۔ ہم سب بھی کبھی لڑکے تھے۔ ایک کا قصہ سنو گے تو دنگ رہ جاؤ گے۔ ابھی کل کی بات ہے ہم میدان سے آ رہے تھے۔ میرے ہاتھ میں لوٹا تھا خیال ہوا کہ بڑے کنوئیں پر لوٹا مانجھ کر پانی بھر لیں۔ جیسے ہی کنوئیں پر پہنچے تو دیکھا۔ ریتو، کلوا کی عورت کا راستہ روکے کھڑا ہے۔ وہ کہہ رہی ہے۔ جانے دو ریتو، تو ریتو کہتا ہے 'ایسے نہیں بھوجی، ویسے کہو۔ ع موری راہ چھوڑ دو گردھاری دیر ہوتی۔ یاد ہے کرشن لیلا والا گانا۔ جب اس نے بالٹی اٹھا کر کہا کہ سارا پانی اُچھل دوں گی تو راستے سے بھاگا۔"

ساتول بڑے زور سے قہقہہ لگا کر ہنسا اور بولا۔

"چچا! یہ بھی کوئی بات ہے۔ بھوجائی ہے وہ ہنسی ٹھٹھا کرتا ہوگا ــــــ جانتے ہی ہو ریتو کیسا ہنسوڑ ہے۔"

لیکن چھپی نے بزرگانہ انداز میں کہا۔

"ہش۔ یہ بھی کیا ٹھٹھا ہے۔ ایسے ہی لڑکے خراب ہو جاتے ہیں۔ یہ تو ہم نے دیکھا تھا

کوئی دوسرا دیکھ لیتا تو نہ جانے کتنی باتیں جوڑ کر کہتا اور بدنامی ہوتی۔ گاؤں میں ایسی بات کبھی نہیں ہوئی۔"

ساونل چپ ہوگیا۔ اور بارھو نہ جانے کب تک بولتا رہتا۔ لیکن سامو نے بیچ ہی میں روک کر کہا۔

"مورے بھاگو تو نے تو کچھ کہا نہیں۔ سنا ہے دھرمپور میں بڑی بڑی سبھا ہوئی۔ بڑے بڑے لوگ جمع ہوئے۔ کسانوں کے فائدہ کی بات ہوئی۔"

بھاگو نے اس انداز سے سب پر نگاہ ڈالی جیسے وہی اکیلا سب کچھ جانتا ہے۔ باقی سب کاٹھ کے الو ہیں۔ پھر بولا۔

"ہاں بہت بڑی سبھا ہوئی تھی۔ ایک سادھو جی بھی آئے تھے۔ وہ سب کو ایک بات کہہ گئے۔ سب کسان ایک ہوجائیں۔ آپس میں مل جل کر رہیں۔ تب ہی زمیندار کے ظلم سے بچ سکتے ہیں۔

ساونل بولا

"بھیا بات پتے کی ہے۔ ہم لوگ پر جتنا ظلم ہوتا ہے اُسے کون جانے۔ سال بھر محنت کر کے اُجاتے ہیں اور ہمارے ہی بال بچے بھوکوں مرتے ہیں۔"

آگ کچھ دھیمی ہو چلی تھی، اس لئے بارھو کچھ اور بھی آگ سے قریب ہوگیا اور بولا۔

"بات تو ٹھیک ہے، پر ہونا مشکل ہے نا؟"

بھاگو بولا۔

"مشکل کیا ہے؟ آج سے ہم لوگ ٹھان لیں کہ آپس میں مل جل کر رہیں گے۔ زمیندار کو بیگار نہیں دیں گے۔ کوئی ناجائز دباؤ نہیں سہیں گے۔ بس ادھر پور میں تو ایسا ہی ہوا ہے۔ اب تو وہاں چین ہی چین ہے۔"

ابھی بات آگے نہیں بڑھی تھی کہ طوفانی میاں آ گئے۔ یہ بوڑھے آدمی تھے اور تیس برس سے گاؤں میں کر گھہ چلاتے تھے۔ طوفانی میاں نے آتے اپنا ٹھریا (معمولی قسم کا حقہ) ذرا الگ رکھ کر ایک دم لگایا۔ اور اس انداز سے سب کی طرف متوجہ ہوئے، جیسے ایک مجسٹریٹ وکیلوں کی بحث سننے کے لئے تیار ہو۔ لیکن طوفانی میاں کو متوجہ دیکھ کر سب کے سب چپ ہو گئے۔ جیسے اب وہ کچھ کہنے والے تھے۔ جب کوئی کچھ نہ بولا تو طوفانی میاں بولے۔

"ارے سب چپ ہو گئے، بات کیا تھی؟"

سانول نے جواب دیا۔

پھاگو دھرم پور گیا تھا طوفانی چچا۔ وہیں کی بات تھی۔"

"کیا بات تھی؟"

طوفانی میاں نے اِس انداز میں سوال کیا، جیسے اگر انہیں نہ بتایا گیا تو پھر کوئی بات ہوئی ہی نہیں سب کا سنا بے کار ہوا۔ پھاگو نے پھر سے ساری بات دہرادی۔ طوفانی میاں نے حقے کا لمبا دم لگا کر بزرگانہ انداز میں کہا۔

"بات تو ٹھیک ہے۔ مگر بھائی یہ کرم کی لکھی باتیں ہیں۔ آدمی کیا کر سکتا ہے۔ یہ سب خدائی کارخانہ ہے۔

طوفانی میاں نے ایک ہی جملے میں سب کی ہمت توڑ دی۔ اب بھلا خدائی کارخانے میں بحث کرنے کا سوال کیسے پیدا ہوتا۔ چھکو تیلی نے کہا۔

"طوفانی میاں نے سولہ آنہ ٹھیک بات کہی ہے۔ پرماتما نے سدا کے لئے آدمی کو بڑا چھوٹا بنایا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اپنا کام ہی نہ چلتا ——"

چھٹو دھوبی نے اور آگے بڑھکر داد دی اور کہا۔

"ہونہہ اگر جمیندار نہ رہے گا تو کوئی نہ رہے۔ سب جمیندار ہو جائیں تو پھر کھیتی کون کریگا۔"

دلّو چپ چاپ بیٹھا سن رہا تھا۔ وہ بڑا جوشیلا تھا، سب کی باتیں سُنکر اس کا خون کھول رہا تھا۔ لیکن اُس کا چچا طوفانی بیٹھا تھا۔ بات آ آ کر اُس کے ہونٹوں پر رُک جاتی تھی۔ لیکن اب اُس سے ضبط نہ ہو سکا۔ اُس نے کہا۔

"اپنے کئے سب کچھ ہو سکتا ہے۔"

طوفانی میاں نے اور اُن کے ساتھ دوسروں نے اس کو آنکھیں نکال کر دیکھا۔ وہ حال ہی میں کلکتہ سے آیا تھا۔ کلکتہ میں وہ جہاز گھاٹ پر قلی کا کام کرتا تھا۔ دن رات محنت، چین جاپان اور امریکہ سے آئے ہوئے مال جہاز سے اتارا کرتا تھا۔ اُس کو کمپنی سے روز جھگڑنا پڑتا تھا۔ وہ پہلے کئی ہڑتالوں میں شریک ہو چکا تھا۔ اور وہ دیہات میں زمینداروں کے ظلم سے بھی واقف تھا۔ اُس نے کہا۔

"ہم لوگ کو اب تیار ہونا ہی پڑے گا۔"

سانول نے کہا۔

"ٹھیک کہتے ہو دلو ــــــــ"

طوفانی میاں نے قہر آلود نگاہوں سے دلو کو دیکھا اور بڑبڑاتے ہوئے اُٹھے۔ "سچ ہے کلکتہ جانے سے آدمی کا دماغ خراب ہو جاتا ہے"۔ اُس کے ساتھ ہی جھپٹو اور ایک دو آدمی اُٹھ کر چلے گئے۔ اور اس انداز سے جیسے اُس جگہ پر کوئی آفت آنے والی ہے۔ لیکن ان لوگوں کو اس کی پرواہ بھی نہ ہوئی۔ بلکہ سانول نے کہا۔

"ظلم پر ظلم ہے۔ پرسوں ہی کی بات ہے منگھو کو پٹواری جی نے مارا ہے۔ بات یہ تھی کہ پٹواری جی چاہتے تھے منگھو کی عورت آکر ان کا چوکا کرے اور اُس نے انکار کر دیا۔"

"یہ سب اب نہیں چل سکتا۔ کل منگھو کو کہا جائے کہ وہ بھی کام کرنے نہ جائے۔"

دلو نے رائے پیش کی۔ اور سب نے ہاں کہی۔ پھر آگے چل کر کیا ہوگا؟ اس پر بھی بحث رہی۔ لیکن سب نے نتیجے سے بے پروا ہو کر یہی فیصلہ کیا کہ پٹواری جی کو رسیدانہ نہ دیا جائے۔ دباؤ ڈال کر دودھ گھی وصول کر لیتے ہیں۔ وہ بھی بند۔ اور بیگاری آخری طور پر ختم ــــــــ"

"بیگار ختم" کہتے وقت دلو نے تھوڑا سا کوڑا کرکٹ اٹھا کر الاؤ میں ڈال دیا۔ الاؤ سے پھر ایک بار تھوڑی سی آگ بلند ہوئی اور بجھ گئی۔ سانول نے کہا۔

"تب دلو ٹھیک ہے نا؟"

دلو نے کہا

پکا بات ہے بھائی۔ مرد بات سے نہیں پلٹتا۔"

بھاگو نے کہا ــــــ "بالکل ٹھیک"

پھر ستیل بولا۔

"لیکن دلو بھیا۔ وہ جو پنڈت جی آتے ہیں نا۔ کہتے تھے کہ تم سب چپ چاپ بیٹھے رہو۔ یہ سب کام کانگرس کر دیگی۔"

سینتل کے بولنے سے جمن کو بھی ہمت ہوئی۔ وہ بھی اپنے ماموں کے گھر گیا تھا۔ وہاں مسلمانوں کا ایک بڑا جلسہ ہوا تھا، جس میں کانگرس کی برائیاں وہ سُن چکا تھا۔ اُس نے کہا

"دِلو بھائی —— کانگریس —— مولانا صاحب تو کہتے تھے ——"

دِلو نے ذرا تیکھے انداز میں کہا۔

"دھت۔ یہ سب بکتے ہیں۔ گریب کا کوئی سالا نہیں ہونا۔ اپنے کرنا ہوگا جو ہو۔"

یہ کہتے ہوئے دلو اُٹھ کھڑا ہوا۔ رات بھی کافی جا چکی تھی۔ الاؤ بھی بجھ چکا تھا اور فضا میں ٹھنڈک کافی پیدا ہو چکی تھی۔ دلو کے اُٹھتے ہی سب کے سب اُٹھ گئے۔

دوسرے دن سے سارے گاؤں میں ہلچل تھی۔ بوڑھے بچے اور جوان سب کے سب کچھ نہ کچھ اس قسم کی باتیں کرتے تھے۔ جوان تو ہر دروازے پر کہتے پھرتے تھے "آج سبھا ہوگی" بچے تماشہ سمجھ رہے تھے اور بوڑھے نتیجے پر غور کر رہے تھے۔ کہ بھس میں چنگاری پڑ گئی۔ پٹواری نے اندر مہتوں اور طوطا رام کو بلا کر خوب ڈانٹا، گالیاں دیں اور صاف صاف کہدیا کہ اگر اس سال تم لوگوں نے بقایا بے باق نہیں کر دیا تو کوئی کھلیان سے ایک دانہ بھی اُٹھا کر نہ لے جا سکے گا —— اس سے جوش اور بھی بڑھ گیا۔

شام کو دو چار نوجوان میدان میں جمع ہوئے بگر زیادہ لوگ کترا کر نکل گئے۔ سبھا کرنے والوں کو سخت غصہ ہوا۔ وہ سب کے گھروں میں پھر گئے۔ اور سب سے کہا۔ سب کا حشر طوطا رام اور اندر مہتوں کا ہوگا۔ تم سب چڑیوں کی ٹولی کی طرح چیں چیں کرتے رہ جاؤ گے اور پٹواری تمہیں باز کی طرح ہر روز شکار کرے گا۔ آج وہ کل وہ۔

صبح اُٹھ کر ساتول منہ دھونے بیٹھا تھا کہ پیادے نے آکر کہا۔

”ساتول بھائی۔ تمہیں پٹواری جی نے بلایا ہے۔ کوئی ضروری بات ہے۔“

ساتول کا ماتھا ٹھنکا تو ضرور، لیکن وہ چور نہیں تھا، جو منہ چھپاتا، منہ ہاتھ دھو کر اُس نے کچھ کھایا پیا اور کچہری کی طرف چلا۔ راستے میں اُسے خیال آیا کہ اس کی خبر دتو کو بھی کرتا جائے۔ جیسے ہی دتو کے گھر کی طرف مڑا، بھاگو اور دتو آتے دکھائی پڑے۔ بھاگو نے ساتول کو دیکھتے ہی کہا۔

”بھیا جانتے ہو کچہری سے بلاوا آیا تھا۔ گماشتہ جی بھی آئے ہوئے ہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ مالک سے کوئی خاص حکم لے کر آئے ہیں —— کیا رائے ہے ——؟

ساتول نے جواب دیا۔

چلو تمہارے دالان میں بیٹھ کر بات کریں گے۔“

تینوں گئے اور بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ بھاگو نے یہ بھی بتایا کہ اُن کی ساری باتیں پٹواری کے کانوں تک جھبو دھوبی پہنچاتا ہے۔ اس سے ساتول کو بڑا غصہ آیا اور وہ بولا۔

”دو سلے کو پکڑ کر چار لاٹھی۔ ہم لوگ سے کھچڑ کھود کھود کر بات پوچھتا ہے اور اپنے

بلوا کو کہہ آتا ہے۔ حرامی!

دلو نے کہا۔

"غصہ کرنے کی بات نہیں سانول۔ کام کرنا ہے۔ دھیرج سے کام کرنا ہوگا ——"

سانول نے کہا۔

"ایسے سالوں کو سزا ضرور ملنی چاہیئے۔"

پھاگو نے پوچھا

"تو اب کیا ہوگا؟"

"ڈرنے کی بات کیا ہے۔ ٹھہرو، پٹواری نے بلایا ہے، وہاں سے ہو آؤں۔ دیکھوں بات کیا ہے؟"

سانول چلا گیا۔ دلو اور پھاگو کچہری سے ہو کر آئے تھے۔ اُن دونوں پر ڈانٹ پڑ چکی تھی لیکن ان دونوں نے سانول سے باتیں اس لئے نہیں کہیں کہ وہ اور بھی غصہ ہو جائیگا ذرا سی بات میں اُس کو غصہ آجاتا ہے اور روکنے کی کوشش اِس لئے نہ کی کہ وہ ہرگز نہ رکتا۔ بلکہ بات اور بھی بڑھنے کا ڈر تھا۔ وہ دونوں دیر تک چپ رہے لیکن پھاگو نے کہا۔

"دلو بھائی سانول کو وہاں نہ جانے دینا تھا۔ گماشتہ جی اگر ٹیڑھے ہو کر بولیں گے تو سانول بھیا نہیں سہ سکتے۔ وہ تیکھے مزاج کے آدمی ہیں۔"

دلو نے ایک لمبے سانس کے ساتھ کہا۔

"یہ ٹھیک ہے۔ پر نہ جانے پر بھی تو بات بڑھتی ہے۔ اب جو بھی ہو دیکھا جائیگا۔"

بھاگو بولا۔

"پھر بھی۔ ۔ ۔ ۔"

یکایک وہ چپ ہو گیا۔ سانول تیزی کے ساتھ سامنے سے آ رہا تھا۔ اُس کا چہرہ لال ہو رہا تھا۔ اور دھوتی پھٹی ہوئی تھی۔ ابھی وہ دلو سے کچھ کہہ بھی نہ سکا تھا کہ سانول آ گیا اور آتے ہی بولا۔

"بھاگو لاٹھی تو دے ــــــ"

دلو اور بھاگو دونوں کھڑے ہو گئے۔ دونوں نے سانول کو سمجھایا مگر وہ تنتا جا رہا تھا ــــــ اُس نے بتایا کہ وہاں پٹواری اور گماشتہ نے ڈانٹا، بات بڑھی اس پر گماشتہ نے پھاٹک بند کروا دیا اور چاہتا تھا کہ مار پیٹ کرے۔ مگر وہ اس طرف کی دیوار کو جو نیچی ہے پھاند کر بھاگ آیا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ جھبٹو اور چھیپی حجام سارے فساد کی جڑ ہیں اور وہ ان دونوں سے بدلہ ضرور لے گا

دلو ہوشیار آدمی تھا، اُس نے سانول کو ایک کمرے میں بند کر دیا اور باہر سے کنڈی لگا دی بھاگو جوش میں تھا اور کچھ ڈر رہا تھا۔ دلو پر کوئی خاص اثر نہ تھا۔ وہ ایسے جھگڑے کلکتہ میں بار بار دیکھ چکا تھا۔ بھاگو کے لئے بات نئی تھی۔ جوش تو ضرور تھا، مگر ایک تو دل کا کچھ کچا تھا اور دوسرے سمجھ بھی زیادہ نہ تھی۔ وہ گھبرا کر دلو کا منہ دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

"اب کیا ہو گا دلو بھائی؟"

دلو بولا۔

"دیکھا جائے گا ——"

اتنے میں گاؤں کے کچھ بڑے بوڑھے آگئے اور لگے دونوں کو سمجھانے۔ دلّو سب کی بات کا ٹھنڈے دل سے جواب دیتا گیا۔ سب سے یہ بھی کہدیا گیا کہ اب کوئی بات نہ ہوگی۔ سالو چلا گیا۔ لیکن جب کچھ جوان آدمی آئے تو دلّو اُن سے بولا۔

"بولو اب کیا ارادہ ہے۔ اب عزت چاہتے ہو یا ذلت ؟"

ذلت کون چاہتا ہے۔ سب نے کہا کہ کچھ بھی ہو ہم ساتھ دیں گے۔ لیکن دلّو نے سب کو سمجھا دیا کہ کوئی اونچی نیچی بات نہ ہونے پائے۔ صرف اب کام یہ کرنا ہے کہ آس پاس کے گاؤں میں لوگوں کو تیار کیا جائے۔ ابھی بات ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ کچہری سے زمیندار کے پیادے لاٹھیاں لیکر سالو کو پوچھنے آئے۔ دلّو نے کہدیا کہ وہ کہیں چلا گیا۔ لیکن چھیپی حجام نے دیکھ لیا تھا کہ وہ اسی مکان میں آیا ہے اور ان دونوں نے اس کو کمرے میں بند کر دیا ہے۔ چھیپی نے پیادوں کو بتا دیا تھا اور پیادوں نے بات بات میں کہدیا کہ چھیپی سے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ اسی مکان میں ہے۔ ایک دو نے یہ بھی کہا کہ وہ اُسے پکڑ کر لے جائے بغیر نہیں ہٹیں گے

اب دلّو کو تاب نہ رہی۔ اس کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا۔ ہونٹ کانپنے لگے اُس نے تنکر کہا۔

"تم اسے نہیں لیجا سکتے۔ اگر تم زمین لال کرنا چاہتے ہو تو کنڈی کو ہاتھ لگاؤ ——"

پیادے آگے بڑھنا چاہتے تھے اگر پندرہ بیس آدمیوں کو دیکھ کر اُن کی ہمت نہ پڑی اُن میں سے ایک دو نے یہ بھی رائے دی کہ چلکر مالک سے سارا حال کہہ سنانا چاہیے۔ بغیر

حکم کے جھگڑا مول لینا ٹھیک نہیں"۔

اس وقت سے شام تک ایک ہی خبر اڑتی رہی۔ گماشتہ جی دوسری جگہوں سے آدمی بلوا رہے ہیں کہ گاؤں لوٹ لیا جائے۔ کھلیان پر قبضہ کر لیا جائے۔ اب کھلم کھلا لڑائی کا اعلان تھا۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے چپ تھے۔ اب کس کی طرف سے بولتے اور کس کو سمجھاتے ——— اور اُن کی سنتا بھی کون تھا۔ ایک طرف تھا حکومت کا غرور، اور دوسری طرف عزت کا احساس۔ ان دونوں میں سمجھوتے کی گنجائش کہاں ہے!

بات بڑھی تو کام بھی بڑھ گیا۔ آس پاس کے سارے گاؤں میں سنسنی پھیل گئی۔ ہر گاؤں کے لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ سب کے ساتھ ایک ہی جیسی بات تھی۔ ہر ایک کو ایک ہی قسم کی مصیبت کا سامنا تھا۔ اب سب کے سب ایک دوسرے کی مدد کرنے پر تیار تھے۔

زمیندار کے کارندے کسانوں سے زیادہ عقلمند ہوتے ہیں۔ اُن کا کام ہی ہے کسانوں پر زمیندار کا رعب باقی رکھنا ان کے لئے کام کرنا تحصیل وصول اور حکم نہ ماننے کی سزا۔ سر اٹھانے والوں کا سر کچلنا۔ اسی لئے تو زمیندار اُنہیں رکھتا ہے۔ یہ لوگ سب کچھ جانتے ہیں کس وقت کیا کام کرنا چاہیے۔ فیل بان جانتا ہے کہ ہاتھی کو کس طرح قبضے میں رکھا جاتا ہے۔

پٹواری جی کچہری سے نکلے اور تھانہ پہنچے۔ ایک رپورٹ لکھوائی۔ گاؤں کے کسان کچہری کو لوٹنا اور کھلیان سے سارا غلہ اٹھا لینا چاہتے ہیں۔ گماشتہ جی گئے اور مالک کے

کان بھرے اور بہکے ہوئے کسانوں کو راستے پر لانے کا سامان ہو گیا۔ یہ لوگ گاؤں میں چڑیوں کی طرح چیں چیں کرتے رہے۔

دو چار دن بھی نہ گزرے تھے کہ ساؤل، ڈِلو اور بھاگو کے ساتھ کئی آدمی کو دفعہ ۱۴۴ کی نوٹس مل گئی۔ وہ نہ تو کھلیان کی طرف جا سکتے تھے اور نہ کچہری کی طرف ——— گاؤں میں ایک بڑی سبھا بھی ہوئی تو یہ لوگ میدان میں نہ جا سکے۔ وہاں کھلیان تھا۔

سبھا ہونے کے بعد کچھ اور لوگ بھی سامنے آ گئے۔ اور اُن پر بھی نظر کڑی پڑنے لگی۔

لیکن آگ جو لگی تھی، وہ کبھی نہیں بُجھتی ہی گئی۔

ساؤل صبح سویرے اپنی ضرورت سے کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا لوٹا تھا۔ سامنے جھیپی آتا ہوا دکھائی پڑا۔ ساؤل ٹھہر گیا۔ جھیپی ٹھہر گیا۔ جھیپی جیسے ہی پاس آیا، ساؤل بولا۔

تم کو ہم سب سے بیر کاہے کا جھیپی بھائی۔ تم کو سوچنا چاہیئے۔ کہ تم بھی کسان ہو"

جھیپی بولا۔

"تم لوگ تو جھوٹ موٹ بدنام کرتے ہو ———"

ساؤل کو اِس کا یہ کہنا دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔ وہ سب کچھ جانتا تھا۔ بولا۔

"دیکھو جھیپی بھائی، یہ سب کہنے سے ہم نہ مانیں گے۔ یاد ہے تم کو۔ اسی پٹواری نے تم کو مارا تھا۔ بات ذرا سی تھی نا۔ ایک دن بدن میں تیل ملنے نہ گئے تھے ——— اپنی بے عزتی بھی بھول گئے"

"جھیبی کترا کر نکل جانا چاہتا تھا۔ بولا۔
"بیکار بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"
سانول نے کہا۔
"یہی تو کہتا ہوں۔ ایسی بات کیوں کرتے ہو جس سے تمہارا کوئی فائدہ نہیں ہے"
لیکن سانول اس بات کو بھول گیا تھا۔ کہ بھاگو کا باپ گاؤں کا پرابل تھا۔ اور
اسی زمانے میں بہت سا کھیت جھیبی سے لیکر زمیندار نے بھاگو کے باپ کو دیدیا تھا۔
اِس سے اُس کا دل اب تک صاف نہیں ہوا تھا۔ گو بات بہت پُرانی ہو چکی تھی۔
جھیبی نے کہا۔
سنو سانول! تم بیچ میں نہ پڑو۔ بھاگو کے باپ نے بڑا ظلم ڈھایا ہم پر . . . ."
"یہ بات بڑی پرانی ہو چکی اسے بھول جاؤ۔ یا کہو تو بھاگو سے کہہ کر تمہارا کھیت
دلوا دوں ——— لیکن یہ تو سوچو کھیت تم سے بارھو چاچا نے تو لیا نہیں۔ لیا تو
تھا زمیندار ہی نے۔ قصور کس کا ہے؟"
مگر جھیبی پر ان باتوں کا اثر کیا ہوتا۔ اُس نے کہا۔
سانول میں تم سے بحث کرنے نہیں آیا ہوں ———"
"سب ٹھیک۔ پر یہ تو بتاؤ۔ اُس دن تم پیادے کیوں لائے تھے۔ ان کو کیوں
بتایا تھا کہ سانول بھاگو کے گھر پر ہے۔ میرے باپ نے تو تمہارا کھیت نہیں لیا تھا۔"
جھیبی کھسیا گیا اور اُس نے کہا۔

"مجھے بحث کرنے کی فرصت نہیں۔"

وہ دو قدم آگے بڑھا۔ لیکن سانول نے اُس کا راستہ روک لیا۔ اور ذرا تیکھا ہو کر بولا۔

"سنو جھیپی بھائی۔ تمہیں جواب دینا ہو گا۔ کسی کی راہ میں کانٹے بچھانا اچھا نہیں یہ تمہارے حق میں بڑا برا ہو گا۔"

جھیپی جانتا تھا کہ سانول غصیل آدمی ہے۔ اِس لیئے وہ کسی طرح بات کاٹ کر نکل جانا چاہتا تھا۔ وہ خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ بھاگو کے باپ پر جو الزام رکھ رہا تھا، وہ بھی غلط تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ گاؤں میں کسی نے کچھ اُس کا بگاڑا نہیں تھا اور وہ صرف اپنے فائدے کے لیئے گاؤں بھر کے آدمیوں کو نقصان پہنچا رہا تھا۔ اور پٹواری تک خبر پہنچانے کے بعد گاؤں کے سارے لوگوں سے الگ سا ہو گیا تھا مگر اب بُرے کے پھندے پڑ گیا تھا۔ سانول کو جواب دیئے بغیر چلے جانا ممکن نہ تھا اُس نے کہا۔

"سانول دیر ہو رہی ہے ہمیں کام ہے راستہ چھوڑ دو۔"

اگر کھُلا ہؤا راستہ ہوتا تو شاید جھیپی کسی دوسری طرف سے چلا جاتا۔ مگر راستہ کے لیئے ایک ہی پگڈنڈی تھی اور اس کے دونوں طرف اوکھ کے گھنے کھیت تھے۔ جس میں آدمی سے زیادہ اونچے اوکھ لہلہا رہے تھے۔ راستہ بالکل نہ تھا۔ اس کے کہنے پر بھی سانول نے راستہ نہ دیا تو جھیپی نے چاہا کہ اس کو ہٹا کر چلا جائے ـــــ لیکن

سانول نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا جھیپی نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا اور بولا۔

"لڑنا چاہتے ہو گیا؟"

سانول بولا

"ہم لڑنا نہیں چاہتے۔ لیکن اس کی ضرورت پڑی تو باز بھی نہ آئیں گے ہم تو تم سے یہی پوچھ رہے ہیں کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟"

جھیپی کو غصہ آچکا تھا۔ اُس نے کہا۔

"کہا تو اس میں کسی کے باپ کا کیا ــــــــ"

سانول کو ایسی باتوں کی تاب کہاں تھی۔ وہ دیر سے اپنے غصے کو دبائے ہوئے تھا۔ گالی جھیپی کے منہ سے نکلی ہی تھی کہ پانی سے بھرا ہوا لوٹا اُس نے جھیپی کے سر پر دے مارا جھیپی کے سر سے خون اور لوٹے سے پانی بہنے لگا۔ اور وہ چکرا کر گر گیا۔ بات اور زیادہ بڑھ گئی۔ شکار خود ہی پھنس گیا۔ پولس آئی اور سانول گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ گواہ کہاں سے آئے؟ مقدمہ میں دوسرے لوگ کیسے پھنسیں۔ مگر روپیہ ہو تو یہ بھی مشکل نہیں۔ روپیہ خرچ کرنے والا ہونا چاہئے۔ کام کون سا ہے جو نہیں ہوتا۔ روپیہ ہو تو ایشور بھی خوش ہو سکتا ہے۔ مندر اور دھرمسالے بنا کر۔ کسی کو پھنسا لینا کیا مشکل ہے۔ زمیندار نے فیصلہ کر لیا کہ چاہے گاؤں اجڑ جائے لیکن سر اُٹھانے والوں کا سر کچلا ضرور جانا چاہئے۔

ایک طرف سانول کا مقدمہ کھلا، دوسری طرف دلو بھاگو اور دوسرے کے خلاف

دھر اُدھر رپورٹیں ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ جب پورا غلہ کھلیان میں آگیا تو اُن سب پر جن پر کسی طرح کا شک تھا۔ دفعہ ۱۴۴ کی نوٹس تعمیل ہو گئی۔ سب کے سب ڈرے کانپ رہے تھے۔ زمینداری تھی زمیندار کی اور راج تھا پٹواری کا ——

آخر اس طرح کب تک چلتا۔ لوگ اُکتا گئے۔ غریبوں کے پاس اتنا روپیہ کہاں سے آئے جو مقدمہ لڑیں اس لئے چپ رہنا ہی بہتر۔ لیکن چپ رہیں تو کبتک دِلو نے بھاگو کو ایک دن بلا کر کہا۔

اب کچھ کرنا چاہئے۔ اگر چپ رہے تو مطلب یہ کہ پٹواری جی من مانی کرتے جائیں گے۔ اب جو بھی ہو۔

بھاگو اور دوسرے لوگوں نے بھی دلوئے کا ساتھ دیا۔ اور بات طے پائی کہ جب تک کھلیان اُٹھے دوسرے گاؤں میں جلسے کئے جائیں۔ اور اِسی پر عمل بھی کیا گیا جب آس پاس کے سارے گاؤں میں تحریک چل پڑی تو دوسرے لوگ بھی جن پر ان کا اثر پڑ سکتا تھا، سر جوڑ کر بیٹھے۔ اور سر پر آنیوالی آفت سے بچنے کی ترکیبیں سوچنے لگے۔

بات بڑھتی گئی اور اُس کا اثر بھی بڑھتا گیا۔ رام دھنی بھی ایک کسان تھا جو ان لوگوں کے ساتھ پورے جوش کے ساتھ کام کر رہا تھا جب سانولی کی ضمانت نہیں ہوئی تو وہ کچھ بول گیا۔ اور سب کے ساتھ بدمعاشوں کی فہرست میں اس کا نام بھی آگیا۔ اور نشانہ بن گیا۔

ایک دن صبح ہونے سے پہلے ہی وہ کسی کام سے دوسرے گاؤں جا رہا تھا اُدھر

دونوں طرف ادکھ کا کھیت۔ ہر طرف سناٹا اور اندھیرا۔ وہ بہت دور جا بھی نہ سکا تھا کہ پیچھے سے کسی نے اُس کے سر پر لاٹھی ماری۔ وہ گر پڑا پھر ایک دو چار پانچ دس ——— وہ ادھ مرا ہو گیا۔ سارے گاؤں میں اس سے کھلبلی مچ گئی

پولس آئی۔ بہت سے لوگ گرفتار ہوئے۔ گرفتار ہونے والوں میں دلو، پھاگو، جمن، ہر کھو سبھی تھے۔ یہ سب کے سب تھانہ سدھارے۔ اُن پر کھیت کاٹنے، کھلیان لوٹنے اور رام دھنی پر حملہ کرنے کا الزام تھا۔ سب کا جیل جانا یقینی۔ پٹواری خوش تھا۔ سارے بدمعاش پکڑے جا چکے تھے ——— وہ اپنی کامیابی پر خوش تھا۔ لیکن آئندہ کیا ہو گا؟ یہ سوال لرزہ خیز طور پر اس کے دماغ میں پیدا ہو جایا کرتا تھا۔

کھلیان بھرتا جا رہا تھا۔ لیکن اب کھلیان میں کسانوں سے زیادہ پولس کے سپاہی نظر آتے تھے۔ انہیں کھلیان کی حفاظت کرنا تھی۔ کسان سارے بے ایمان ہو چکے تھے۔ اور اُس کی سزا بھی پا چکے تھے۔ مگر یہ بوڑھے اور بچے گاؤں میں بچ رہے تھے وہ بھی تو آخر کسان ہی تھے۔

پوس کا مہینہ تھا۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ کھلیان کی حفاظت کرنے والے سپاہی اپنے گرم کوٹوں کے باوجود ٹھنڈک سے سکڑے جاتے تھے۔ سب نے مل کر بڑا سا الاؤ جلایا تھا۔ آگ تاپ رہے تھے اور کہانیاں کہی جا رہی تھیں۔ الاؤ بجھنے لگا۔ ایک سپاہی اُٹھتے ہوئے بولا۔

"ایک دن ساری چیز اسی طرح ختم ہو جائے گی۔"

دوسرا بولا

"سالے پٹواری کھچڑ۔ اوہ لائن میں کیسے آرام سے رہتے ہیں اس وقت۔"

اُس کے اُٹھتے ہی دوسرے سپاہی بھی اُٹھ کر جھونپڑے میں چلے گئے اور الاؤ بجھ گیا۔

کھلیان میں سپاہیوں کا شور گاؤں کے سناٹے میں ہل گیا ———— !

زمین پر الاؤ کی آگ بجھتی جا رہی تھی اور آسمان پر دھواں چھا رہا تھا۔

اندھیرے اور اجالے میں

اندھیرے میں

رات کے بارہ بج چکے تھے بنگلہ سے باہر باغ میں کبھی کبھی اُلو کے بولنے کی آواز گونج اُٹھتی تھی۔ ورنہ ہر طرف بھیانک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس خوبصورت اور لمبے چوڑے مکان میں صرف تین آدمی تھے۔ دو نوکر اور ایک مالک۔ باغ کا مالی دور ایک کونے پر اپنی چھوٹی سی جھونپڑی میں پڑا سو رہا تھا۔ دونوں نوکر سائبان کے پاس والے کمرے میں اونگھ رہے تھے لیکن مکان کا مالک "اختر" جاگ رہا تھا اس کو ایک بےچینی سی تھی۔ وہ کبھی مسہری پر لیٹ جاتا اور کبھی اُٹھ کر ٹہلنے لگتا۔ کبھی سائبان میں آتا اور باغ کے پھاٹک تک نظر دوڑاتا۔ لیکن ہر طرف سناٹا دیکھ کر پھر کمرے میں واپس آجاتا تھا۔

اختر نے الماری میں سے ایک کتاب نکالی اور میز کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ کتاب کو پڑھنے لگا۔ ایک ہی منٹ میں اُس کو تھکن معلوم ہونے لگی۔ اُس نے سگریٹ کیس سے سگریٹ نکالا اور جلا کر پینے لگا۔ پھر کتاب دیکھنے لگا۔ لیکن دماغ میں اور ہی باتیں چکر کاٹ رہی تھیں۔ کتاب میں اُس کی طبیعت نہ لگی۔ وہ کرسی سے اُٹھا۔ پہلی کتاب الماری میں رکھ دی دوسری کتاب الماری سے نکال لایا۔ اور ورق اُلٹنے لگا۔ مگر اس کتاب میں بھی اُس کا دل نہ لگا ـــــ تو صرف تصویریں ہی دیکھنے لگا۔ بار بار تصویروں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ پہلا سگریٹ ختم ہو گیا تو اُس نے دوسرا جلایا۔ اور کتاب کو میز پر رکھ کر سائبان میں آیا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ وہ کئی منٹ تک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہر طرف نظر دوڑاتا رہا۔ آخر بے آس ہو کر کمرے میں واپس آیا۔ اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا۔ پھر کتاب کے ورق الٹنے لگا۔

تھوڑی ہی دیر میں اُس کو اپنا بدن گرتا ہوا معلوم ہونے لگا۔ آنکھوں میں جلن اور ہاتھ پاؤں میں ڈھیلا پن محسوس ہونے لگا۔ بار بار نیند کا سایہ دماغ پر پھیلنے لگا۔ وہ جمائی لیکر کرسی سے اُٹھا۔ کرسی کو گھسیٹ کر مسہری کے پاس لایا۔ اُس پر لیمپ رکھ کر مسہری پر لیٹ گیا اور تصویریں دیکھنے لگا۔ گھڑی نے ساڑھے بارہ بجائے۔ اُس کے چہرے پر مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ لیکن پھر اُسے خیال آیا۔ موٹر اب تک نہیں آئی ہے۔ میرا خیال غلط ہے۔ دوبارہ آس بندھی۔ وہ جاگنے کیلئے پھر تصویریں دیکھنے لگا۔ مگر اُس کی آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں۔ اور کوشش کر کے جاگ رہا تھا۔

دیر تک اُس کا یہی حال رہا۔ کبھی تصویریں دیکھتا اور کبھی مکان کی چھت کو۔ اور اُس کی کڑیاں گنتا۔ کڑیوں کی تعداد کبھی سولہ ہوتی کبھی اُنیس اور کبھی اٹھارہ۔ وہ کڑیوں کو صحیح طور

سے نہ گن سکا۔ تو اکتا کر نظر اُدھر سے پھیر لی اور اپنی میز کو دیکھنے لگا۔ میز پر قلمدان بے ڈھنگے طور سے رکھا تھا۔ اُس نے چاہا کہ اُٹھکر اُس کو ٹھیک کر دے۔ مگر نہ اُٹھ سکا۔ دیر تک دیکھتا اور سوچتا رہا۔ پھر اُس نے اپنی کتابوں کی الماری کو دیکھا۔ اُس کو معلوم ہوا جیسے نوکر نے بعض کتابیں اُلٹی رکھ دی تھیں۔ اُس کو بڑا غصہ آیا۔ اُس نے چاہا کہ نوکر کو پکار کر ڈانٹے۔ لیکن نہ پکار سکا۔ چپ چاپ مسہری پر پڑا رہا۔ پھر اُس نے دروازہ کی طرف دیکھا۔ دروازہ سے باہر گہری تاریکی تھی۔ کچھ نظر نہ آیا۔ اسی حالت میں نیند نے اُس کو آ لیا:۔

یکایک موٹر کی آواز سے وہ اُٹھ بیٹھا۔ اور ہتھیلیوں سے آنکھیں ملکر دروازہ کی طرف دیکھنے لگا۔ موٹر سے کسی کے اُترنے اور پاؤں کے چاپ کی آواز اس کے کانوں میں پھیلی پھیلی سی آئی ——— پھر ایک خوبصورت جوان عورت بالکل سادہ کپڑے پہنے اُس کے کمرے میں آئی اور آتے ہی بولی۔

"معاف کیجیے گا۔ بڑی دیر ہو گئی"

اختر نے اُسی طرح آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔

"او پیاری! تم نے بڑی راہ دکھائی۔ میں تو سمجھتا تھا کہ آج کی رات تمہاری خیالی تصویر کے ساتھ کھیل کھیل کر گزارنی ہوگی۔ نہ جانے کیسے نیند آگئی۔ خیر تم آگئیں۔ اطمینان ہوا۔ خدا کیلیے اتنی دیر نہ کیا کرو ورنہ وقت گزارنا میرے لیے کٹھن ہو جائیگا۔ آہ تم کو کیا معلوم . . . "

شوخ زہرہ نے مسکرا کر کہا۔

"جی ہاں دیر تو ضرور ہو گئی۔ معاف فرمائیے۔ اصل میں آج دو مجرے ہوئے ہیں ختم کر کے فوراً ہی چلی آئی۔ اُف میں خود بھی بہت تھک گئی ہوں"۔

"مگر تم کو کچھ میرا خیال بھی کرنا چاہیئے زہرہ!" اختر نے شکایت کے طور پر کہا۔

"جی ہاں۔ مجھے آپکا کتنا خیال ہے۔ کیا بتاؤں۔ لیکن آپ نے اجازت دے رکھی ہے اُس سے فائدہ اُٹھانے کا خیال ہو گیا"۔

اختر زہرہ کیطرف اس انداز سے بڑھا۔ جیسے بھوکا کھانیکی چیز کیطرف اور اُسکا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

"تم سے میں نے کل ہی کہدیا تھا کہ کسی قسم کی فکر نہ کرو۔ لیکن لالچ بری بلا ہے۔ دوسرے ہی دن سے تمہارا یہ طریقہ ہے۔ آہ تم کو کیا معلوم کہ جو محبت کرتا ہے۔ اُسکے دل پر کیسی گذرتی ہے"۔

زہرہ اختر کے پاس مسہری پر بیٹھ گئی۔ اور اُس کے بالوں سے کھیلتی ہوتی بولی۔

"آپ کو کیا بتاؤں کہ مجھے آپ سے کتنی محبت ہے"۔

اختر نے شکایت کے انداز میں کہا۔

"نہیں زہرہ! اگر تم محبت کرتیں تو دیر ہرگز نہ کرتیں۔ مگر تم لوگوں سے محبت کی امید ہی فضول ہے۔ تم محبت کو کیا جانو۔ صرف روپیہ کو جانتی ہو۔ یہ میری ہی غلطی ہے کہ تم سے محبت کی امید رکھتا ہوں"۔

زہرہ نے مسکرا کر اختر کو اپنے قریب کھینچنا چاہا۔ لیکن خود کھنچ گئی۔ تو اختر کے زانو پر لیٹ کر اُس کے گالوں پر ہاتھ پھیرتی ہوئی بولی۔

"تم ایسا سمجھتے ہو پیارے۔ اچھا لو میں کل سے ٹھیک دس بجے پہنچ جایا کرونگی۔ کل سے کسی کلموہے سے بات بھی نہ کروں گی۔ اب ہنس دو"۔

زہرہ نے اختر کے گلے میں باہیں ڈال دیں اختر سب کچھ بھول گیا اور وہ بولا۔

"زہرہ! میری پیاری۔ تم کو اختر کے دل کا حال کیا معلوم۔ سچ کہتا ہوں۔ تمہارے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکتا ——— آہ"

زہرہ نے اختر کو مسہری پر لٹاتے اور خود بھی لیٹتے ہوئے کہا۔

"پیارے ڈیڑھ بج گیا ہے۔ بہت نیند آ رہی ہے۔ تھکی ہوئی بھی ہوں۔ سو جاؤ اب"

اختر بولا "اب میرے دل کو قرار آیا۔ تو تمہیں نیند آنے لگی"

زہرہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اختر بہت دیر تک زہرہ سے محبت بھری باتیں کرتا رہا اور زہرہ نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں اُس سے باتیں کرتی رہی۔ آخر دونوں کو نیند نے اپنی گود میں لے لیا۔

اُجالے میں

پانچ بجتے ہی گھڑی نے الارم بجانا شروع کر دیا۔ اختر اُٹھ بیٹھا۔ اُسنے اِدھر اُدھر دیکھا پھر بولا۔

"زہرہ اُٹھو صبح ہو گئی"

لیکن زہرہ گہری نیند میں تھی۔ اُسنے کوئی جواب نہیں دیا۔ اختر نے زہرہ کا شانہ ہلکے سے ہلا کر کہا

"زہرہ صبح ہو گئی۔ اب اُٹھ جاؤ"

لیکن زہرہ نے بدن کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

"مجھے نہ اُٹھایئے۔ رات بہت تھکی ہوں"

لیکن اختر پر اُسکا کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ وہ پھر اُس کو ہلاتے ہوئے بولا۔

"نہیں زہرہ۔ صبح ہوگئی۔ اب اُٹھ بیٹھو۔ اُٹھو۔"

مگر زہرہ نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

"رات بہت تھکی ہوں پیارے۔ بلا سے صبح ہوگئی۔ مجھے سونے دو۔"

اختر نے اُٹھ کر کمرے کا دروازہ کھول کر باہر دیکھا۔ آسمان پر آہستہ آہستہ سفیدی پھیلتی جارہی تھی۔ وہ تیزی کے ساتھ مسہری کے پاس آیا۔ زہرہ گہری نیند میں تھی۔ ایسی گہری نیند میں تھی۔ ایسی گہری نیند میں تھی کہ اُس کو اپنے کپڑوں کا بھی ہوش نہ تھا۔ مگر اختر نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اور کھینچتے ہوئے کہا

"زہرہ۔ زہرہ اُٹھو۔ بالکل صبح ہوگئی۔ . . ."

مگر زہرہ نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ اور منہ بنا کر بولی۔

"آپ بہت تنگ کرتے ہیں سونے دیجئے مجھے۔ بلا سے صبح ہوگئی۔"

اختر بہت گھبرایا۔ وہ پھر دروازے کے پاس گیا۔ باہر آسمان کو دیکھا اور تیزی سے واپس آکر بولا۔

"نہیں زہرہ اُٹھو۔ اُٹھو جلدی کرو۔ بالکل ہی صبح ہوگئی۔"

"میری بلا سے صبح ہوگئی —— اُف آپ بہت تنگ کرتے ہیں۔"

اختر نے گھبرا کر کہا۔

"نہیں زہرہ ضد نہ کرو۔ اُٹھو جلدی کرو۔"

بار بار نیند میں تنگ کرنے کی وجہ سے وہ ذرا چڑ کر بولی۔

میری جوتی سے صبح ہوگئی۔ میں نہیں اُٹھوں گی سو رہئے اب تنگ نہ کیجئے۔ مجھے سونے دیجئے۔ میری طبیعت خراب ہو جائیگی۔"

اختر گھبرا کر کمرے میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔ پھر بھاگ کر باہر سائبان میں گیا۔ سورج تو نہیں نکلا تھا۔ لیکن آسمان پر پھیکی پھیکی روشنی پھیل چکی تھی۔ ستارے ڈوب چکے تھے۔ موٹر اب بھی برساتی میں کھڑی تھی۔ ڈرائیور کو اٹھا کر کمرے میں واپس آیا۔ اور زہرہ کو جھنجھوڑ کر اٹھانے لگا۔ زہرہ نے لجاجت کے ساتھ کہا۔

"مجھے مت اُٹھایئے۔ میری طبیعت خراب ہو جائے گی۔ سونے دیجئے۔ خدا کیلئے۔"

"موٹر لگی ہے۔ گھر جا کر سو رہو زہرہ۔"

اختر نے کہا۔ لیکن زہرہ نے چڑ کر کہا۔

"میں نہیں اُٹھوں گی جایئے۔"

اختر نے بھی چڑ کر جواب دیا۔

"یہ بیکار بات ہے۔ تمہیں اُٹھنا ہو گا۔ اُٹھو۔ اُٹھو!

اتنے میں گھڑی نے چھ بجائے۔ اختر اور بھی گھبرا گیا۔ اُس نے زور زور سے زہرہ کو جھنجھوڑ کر کہا۔

"اُٹھو اُٹھو! گھر جاؤ۔ ابھی گاڑی اسٹیشن جائے گی۔

"بلا سے جانے دیجئے۔ دیکھئے اب اُٹھایئے گا تو میں رونے لگوں گی۔ آپ سے لڑ پڑوں گی۔"

اختر نے بگڑ کر کہا۔

"یہ ضد اور بدتمیزی مجھے اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ اُٹھو۔ اُٹھو۔"

زہرہ اُٹھ بیٹھی سخا انکھی نظروں سے اختر کو دیکھ کر اور منہ بنا کر بولی۔

"آپ پر یہ کیا دیوانگی سوار ہے"

اختر نے پھر کہا۔

"دیکھو پاگل مت بنو۔ موٹر موجود ہے۔ گھر جا کر سو رہو۔ ابھی میرے بھائی صاحب آنے والے ہیں۔ موٹر انھیں لانے کو اسٹیشن جائے گی"

زہرہ نے ذرا تیز آواز سے کہا۔

"تو جانے دیجئے۔ مجھے خواہ مخواہ کیوں اُٹھا رہے ہیں میں تو سوتی ہوں"

اختر نے ہاتھ پکڑ کر زہرہ کو کھڑا کر دیا۔ اور دروازہ کی طرف اُس کو بڑھاتے ہوئے بولا۔

"جاؤ گھر جا کر سو رہو۔ جلدی کرو"

زہرہ بولی۔

"اور آپ سے مجھے ایک ضروری بات بھی کہنا ہے"

اختر نے اُس کو دروازہ کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔

"اب بات بھی ختم کرو۔ جاؤ جلدی۔ بھائی صاحب شام کی گاڑی سے چلے جائینگے دس بجے آجانا پھر بات کر لینا"

زہرہ نے غصہ میں کہا۔

"جی ہاں مجھ پر تو خانا آشنائی کا الزام تھا۔ رات کو کیا ننگ تھا اور اب کیا ہے

اور پھر رات کو بلاوا ابھی ہے۔ کیوں نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اختر کو تاب نہ رہی اور وہ غصہ ہو کر بولا۔

"آہ جاؤ جلدی۔ اِس وقت دیر کرو گی۔ تو سارا کام بگڑ جائیگا۔"

زہرہ نے غصہ میں کہا۔

"جی ہاں کیوں نہیں۔ رات کو میرے بغیر کام نہیں چلتا۔ اور دن کو میرے رہنے سے کام بگڑ جائے گا۔ ہم لوگ تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اختر کانپنے سا لگا۔ اور بولا۔

"جاؤ۔ دفع ہو۔ نکلو بھی ——"

اُس نے زہرہ کو اور کچھ بولنے کا موقع نہ دیا۔ گھسیٹ کر موٹر پر لا بٹھایا۔ اور ڈرائیور سے اُس کو پہنچا دینے کا اشارہ کیا۔ چند منٹ میں موٹر روانہ ہو گئی۔ وہ کھڑا موٹر کو دیکھتا رہا۔ جب موٹر باغ کے دروازے سے باہر جا چکی تو اختر کو اطمینان ہوا۔ وہ کمرے میں واپس آیا۔ اور مسہری پر لیٹ کر ایک لمبی سانس لی۔

(۳)

دو مزدور

چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن کے پاس ہی چینی کا ایک بڑا سا کارخانہ تھا۔

اسٹیشن اور کارخانہ کے درمیان کچی سڑک پر پھوس کی ایک جھونپڑی تھی جھونپڑی کے دروازے پر ایک تختی ٹنگی تھی جس پر لکھا تھا "گرم چائے" جھونپڑی کے اندر مٹی کا ایک چبوترہ تھا میز کرسی کے بدلے تاڑ کے پتوں کی چٹائی تھی چبوترے پر دو تین میلی اور ادھ ٹوٹی پیالیاں رکھی تھیں، اور دو تین میلی کچیلی دیگچیاں۔ ہوٹل کی ٹٹی والی دیوار چبوترے کے علاوہ سامنے سڑک تک پر مکھیوں کی ایک عظیم الشان فوج پڑاؤ ڈالے تھی۔ سامنے سڑک پر کیچڑ سے ذرا ہٹ کر ایک مریل سا کتا بیٹھا تھا ــــــ مزدوروں کا ہوٹل اور کیسا ہوتا۔

گاڑی آنے میں ابھی دیر تھی، بوڑھا ہوٹل والا جس کی ایک آنکھ "ماتا میا" کی بھینٹ

چڑھ چکی تھی۔ جلدی جلدی پانی گرم کرنے کی فکر میں تھا کبھی وہ میلی سی دیگچی کو چولھے سے اتار کر پنکھا جھلتا۔ اور کبھی دیگچی کو چولھے پر رکھ کر۔ کوئلہ کچا تھا۔ اس لئے ساری جھونپڑی دھوئیں سے بھری تھی۔ بوڑھا کبھی کبھی بیتابی کے ساتھ سڑک پر دور تک نگاہ دوڑاتا۔ پھر آپ ہی آپ بڑبڑانے لگتا۔ "اب تک نہیں آئی حرامجادی۔"

بوڑھا تھک گیا۔ پنکھے کو الگ رکھتے ہوئے اس نے ذرا پریشانی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ! بڑھاپے میں ہی سب دکھ لکھا تھا۔"

اتنے میں ایک بوڑھی عورت ایک ٹوکری بھر کوئلے لئے ہوئے آئی۔ بوڑھے نے اس کو غصہ بھری نظروں سے دیکھا لیکن آہستہ آہستہ کچھ بڑبڑا کر رہ گیا۔ بوڑھی عورت نے ذرا تیز ہو کر کہا۔

"تمہیں تو گسا ہی آتا رہتا ہے۔ سب کام بھلے اپنے ہی کرلو۔"

بوڑھے نے کہا۔

"ارے جمن کی ماں! تم تو بے بھول ہی بگڑ جاتی ہو۔ دیکھو نہیں سب کے آنے کا بیلا (وقت) ہو گیا۔"

بوڑھی عورت منہ پھلا کر ایک طرف چپ چاپ بیٹھ گئی۔ بوڑھے نے جلدی جلدی چولھے پر کوئلہ رکھا، اور زور زور سے پنکھا جھلنے لگا۔ آنچ اچھی ہو گئی تو بوڑھا جلدی جلدی پیالیاں دھونے لگا۔ اتنے میں کارخانے کا "بمبا" بجا، مزدوروں کو چھٹی ہو گئی۔ اور وہ سب کارخانے سے نکلے —— جیسے رات بھر کی بند مرغیاں صبح کو ڈربہ کھلنے پر ——

بوڑھا پھر گھبرا کر اٹھا۔ پیالیوں کو چبوترے پر رکھ کر چولھے کو دیکھنے لگا۔ چولھے میں آنچ

ٹھیک تھی۔ مگر اس سے اُسے تشفی نہ ہوئی۔ اُس نے کہا۔

"ارے جمن کی ماں! ذرا پنکھا تو جھل"۔

بوڑھی عورت اسی طرح منہ لٹکائے بیٹھی رہی۔ اپنی جگہ سے ذرا بھی نہ ہٹی۔ بوڑھے کو غصہ آگیا۔ وہ بڑبڑانے لگا۔

معلوم ہوتا ہے جیسے ہم ہی اکیلے کھاتے ہیں۔ پگلی!! اس کو کوئی غرض ہی نہیں، آج میری آنکھ بند ہو جائے تو کل ہی تیتہ چل جائے۔ کوئی بھیک تو دے ہی نہیں اس چال سے ' بوڑاہی کہیں کی۔ جا ہم بھی ———"

اتنے میں چند مزدور ہوٹل میں آگئے۔ بوڑھے نے بکنا بالکل بند کر دیا فوراً آنے والوں کی طرف مخاطب ہوگیا اور لگا آپ ہی آپ بولنے۔ جیسے وہ باری باری سب کی باتوں کا جواب دے رہا ہے۔

"آج تو ایسی اچھی روٹی پکی ہے کہ واہ رے واہ۔ اور بھاجی تو ایسی ہے کہ کھا کر جی خوش ہو جائے۔ اُس کو کھا کر آدمی گھنٹوں کیا ہفتوں مزا نہیں بھول سکتا۔ بیٹھو بھائی بیٹھو! سب کو دیتے ہیں۔ ذرا چائے کا پانی ہو رہا ہے"۔

بوڑھا پھر آنے والے مزدوروں کی طرف مخاطب ہوا، اور سب سے پوچھنے لگا۔ "تمہیں کیا چاہیے؟ تمہیں کیا چاہیے؟"

پھر کسی کو روٹی بھاجی، کسی کو بھات دال، کسی کو گوشت روٹی ——— جس نے جو مانگا اُسے دیا۔ اداس جھونپڑی میں زندگی کی لہر دوڑ گئی، کچھ دیر تک چہل پہل رہی۔ پھر ایک

کے بعد دوسرا اٹھ کر چلا گیا۔ صرف تین چار مزدور رہ گئے۔ بوڑھے نے سب سے کہا۔

"بیٹھو بھائی بیٹھو! ابھی چائے دیتے ہیں۔"

اس نے دیگچی میں چائے کی پتی ڈال دی۔ پانی چوٹھے پر کھولتا رہا۔ بڈھے نے کہنا شروع کیا۔

"آج تو وہ چائے پلائیں گے کہ بس لے لیں۔ جب ہم میکلین صاحب کے یہاں تھے بھائی،

تو ایک صاحب آیا۔ پارٹی تھا۔ بڑا پارٹی۔ ہاں بہت سے صاحب لوگ آئے میم صاحب بھی۔

بڑا دعوت میں ہمارے پکائے کھانے کی صاحب لوگوں نے بہت تعریف کیا۔ اور صاحب نے

دس روپیہ انعام دیا.......

ایک جوان مزدور بولا۔

"ارے بوڑھا میاں دو جلدی چائے۔ تم بکتے ہو۔"

بوڑھا بولا۔

"ہاں بابو ابھی دیتے ہیں۔"

دوسرا مزدور جس کی عمر چالیس سے زیادہ تھی۔ بولا۔

"ارے بلاقی! تیرا جبان بہت کھراب ہو گیا ہے۔"

بلاقی نے جواب دیا۔

"نہیں جمرو بھائی! بوڑھا بکتا بہت ہے۔ بالکل بے پھول۔"

بلاقی بالکل جوان تھا۔ بالکل کالا اور ہٹا کٹا۔ سر میں انگریزی بال اور ٹیڑھی مانگ۔ تیل سے

سر کے بال چمک رہے تھے۔ بوڑھے نے سب کو چائے بنا کر دی ضمیر نے بلاقی سے کہا۔

"ارے کھانساماں جی تیرے باپ کے عمر سے جادے ہی ہیں۔ ان کو ایسا کہتا ہے"

"نہیں جمرو بھائی یہ تو کھیل کی بات ہے۔ بڑے میاں اپنے ہی آدمی ہیں۔"

ضمیر بولا۔

"نہیں۔ تیرا جبان کھراب ہے ہی۔ اچھا کل بابو سے کاہے کو لڑ رہا تھا"

بلاقی نے شکایت کے طور پر کہا۔

"سالے نے کل پھر گر جا جر بنا دیا جمرو بھائی! بڑا کھچڑ ہے سالا۔"

"ارے گالی کاہے کو بکتا ہے کوئی کھائدہ ہوگا اس سے ——— بابو سے لڑ کر۔"

بلاقی نے چائے کی پیالی اُٹھانے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تو اِس سالے کو کیا ملے گا؟ سیٹھ باپ ہے اسکا اسی کو تو سالا دھن مل جائیگا پانچ منٹ دیر ہوا اور سالے نے گیر ہاجر کر دیا۔"

"اس بیچارے کا تو کام ہی یہی ہے۔ لڑائی بُری بات ہے کھوسامد برامد سے آدمی کو کام نکالنا چاہیے بلاقی۔"

تم بھی جمر بھائی کیسی بات کرتے ہو۔ کھوسامد کاہے کی۔ بھیک تھوڑے دیتا ہے سالا۔ اب کی بدماسی کرے گا تو دیں گے دو چپیٹ۔"

ضمیر نے بلاقی سے چڑ کر کہا۔

"ارے پاگل مت بن، بات سمجھا کر"

بلاقی نے تن کر کہا۔

"ارے بھیا! جو جی میں آئے کہہ لو، یونین نہیں ہے یہاں نہیں تو تین چار دن کی ہڑتال میں ہوش آ جاتا سب کو۔"

ضمیر کو ذرا غصہ آ گیا، وہ بولا۔

"پھول یونین یونین بکتا ہے گریب کو وہاں بھی کوئی نہیں پوچھتا۔ اے ہم خد یونین کے مارے بھٹے ہیں۔ دیکھ —— میں ہم کو ساٹھ روپیہ مہینہ ملتا تھا۔ ہڑتال ہوا یونین والے بھاگ گئے سب سالے تو پھر نوکر ہو گئے۔ ہم کو دیکھ اب بیس روپیہ مہینہ پر سر مار رہے ہیں مصیبت میں کوئی کسی کا نہیں ہوتا ہے، اپنے اب کوئی یونین والا پوچھنے بھی نہیں آتا۔ چھ مہینہ بھوک مر مر کے کاٹا ہے۔"

بلاقی نے بہادرانہ شان سے جواب دیا۔

"بس اتنے میں ہی ٹھنڈے ہو گئے، کاہے کو گئے تھے یونین میں تب۔ ہم کہیں —— سنو —— مل میں جب ہڑتال ہوا تو ہم بھی تھے، وہاں لڑائی ہو گئی۔ پولس نے ہم لوگ کے سیکرٹری پہ لاٹھی چلایا۔ ہم جھٹ سے لاٹھی روک کر سپاہی کو دو چپیٹ مارا۔ جانو بھیا! کا ہوا!! ہم گرفتار ہو گیا۔ سپاہی سالا نے —— ہم کو تھانہ میں خوب مارا۔ اور چھ مہینہ کا جیل ہو گیا۔ ایسے ڈرنے سے پھانسی سے بھی نہ بھاگے گا۔ مگر اپنا حق واسطے لڑیں گے جرور۔ اور سب مجور بھائی کو مل کر لڑنا چاہیئے ——"

ضمیر چپ چاپ سنتا رہا۔ جیسے کوئی بیوقوف آدمی کسی عقلمند کی بات سنتا ہو۔ بلاقی اس شان سے بولتا رہا۔ جیسے وہ کسی عظیم الشان مجمع کو مخاطب کر کے تقریر کر رہا ہو جب بلاقی

بول چکا تو ضمیر نے کہا۔

"بول تو بھیا! ابھی جوان ہو۔ کوئی پھکر نہیں، آجاد ہو۔ دو چار بال بچہ ہوتا تو معلوم ہوتا۔"

بلاتی اسی جوش میں بولا۔

"یہ گلت ہے۔ جیتا رہے تو دیکھ لینا ———"

بوڑھے ہوٹل والے کی عورت اب تک اسی طرح منہ پھلائے بیٹھی تھی۔ کبھی زہر بھری نظروں سے بوڑھے کو دیکھتی اور کبھی ٹرّاتی۔ بوڑھا ہوٹل والا جلدی جلدی جھوٹے برتن دھو رہا تھا۔ اور آپ ہی آپ بڑبڑاتا جا رہا تھا۔ ضمیر اور بلاتی دونوں ہی چپ چاپ اپنی اپنی چائے ختم کر رہے تھے آخر دونوں کی چائے ختم ہو گئی۔ بلاتی نے پوچھا۔

"اور چائے پیو گے جمرو بھیا!"

"نہیں ———"

ضمیر نے جواب دیا۔ بلاتی نے پیالی رکھ کر جیب سے ایک ٹین کی ڈبیہ نکالی۔ اس سے بیڑی نکال کر ضمیر کو دی۔ ایک اپنے ہونٹوں میں دبا کر چولھے سے آگ لے کر جلانے لگا۔ بوڑھی عورت بڑبڑانے لگی، مگر اس نے ذرا بھی پروا نہ کی۔ بلاتی، بیڑی جلانے کے بعد ڈبیہ پر لگے ہوئے چھوٹے سے شیشے میں دیکھ کر انگلیوں سے بال سنوارنے لگا۔ اور بال سنوارتے ہوئے بولا۔

"بڑے میاں! جمرو بھائی کا ناشتہ چائے میرا حساب میں لکھیو ———"

اتنا کہہ کر وہ جھونپڑی سے باہر نکلا۔ بولا۔

"اچھا سلام جمرو بھیا!"

پھر وہ اپنے ہاتھ سے بالوں کو درست کرتا اور موٹی آواز میں "مرے مولا بلالو مدینہ مجھے" گاتا ہوا ایک طرف روانہ ہو گیا۔ بوڑھے ہوٹل والے نے ضمیر سے نصیحت کے انداز میں کہا۔

"کس بوڑا ہے سے بولتے ہو بھیا۔"

بڑھیا بیٹھی بیٹھی بول اُٹھی۔

"ہی ہے کھراب، لونڈا پگلا معلوم ہوتا ہے۔"

بلاقی کے گانے کی دھیمی آواز اب تک جھوپڑی میں آ رہی تھی ✦

کھویا ہوا لال

ساون کی رات تھی آسمان کالے کالے بادلوں سے ڈھنکا ہوا تھا تین دن سے موسلا دھار پانی برس رہا تھا ایسا اندھیرا تھا کہ پاس کی چیزیں بھی دکھائی نہ پڑتی تھیں کبھی کبھی بجلی چمک جاتی تھی معلوم ہوتا تھا کہ دنیا میں پانی اور بادلوں کے علاوہ دوسری چیز بھی ہے —— اور نہ پانی برسنے یا بادل کڑکنے کی آواز کے سوا اور کوئی دوسری آواز بھی سننے میں آتی تھی۔

بوڑھی یفاتن اپنی چارپائی پر پڑی تھی۔ وہ سوجانا چاہتی تھی مگر نیند اس کی آنکھوں سے غائب تھی۔ اس کا دل گھبرا رہا تھا، اس کو اپنے بوڑھے شوہر کا خیال آیا اور تینوں بیٹوں کا، جو پیٹ کا دھندا کرنے گھر سے سینکڑوں کوس دور پردیس ہی تھے۔ مگر پھر اس کا خیال بہک گیا۔ وہ اپنی جوانی کے واقعات پر غور کرنے لگی بہت سی باتیں یاد کر کے اس کو خوشی ہوئی اور بہت سی

باتیں یاد کر کے رنج ہوا۔ پھر خیال بہک کر شوہر اور بیٹوں کی طرف چلا گیا۔ اُس نے خیال کیا دن بھر کے تھکے ماندے اسوقت آرام کی میٹھی نیند سو رہے ہونگے۔ اسکے دل کو کچھ سکون ہوا۔ آنکھیں جھپکیں اس کو گرمی معلوم ہونے لگی۔ دل گھبرانے لگا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ سوچنے لگی۔ آخری وقت ایسا ہی ہوتا ہے۔ اب کیا؟ زندگی کے پانچ چھ سال اور باقی ہوں گے زیادہ سے زیادہ دس سال۔ اس کا دل زور زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ وہ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

یکایک اسکو محسوس ہوا کہ مکان کے باہر کوئی آدمی پھر رہا ہے۔ وہ ڈر سے کانپ گئی۔ شاید چور ہو۔ پھر باہر سائبان میں پاؤں ٹپکنے کی آواز آئی۔ اسکو یقین ہو گیا کہ باہر کوئی آدمی ضرور ہے۔ اس کا سانس رُک رُک کر چلنے لگا۔ . . . اُس کی دونوں بہوئیں دوسری کوٹھری میں سوئی ہوئی تھیں۔ سوچنے لگی کہ جاکر اُٹھائے مگر پاؤں سو سو من کے ہو گئے۔ پھر چاہا کہ پکارے مگر منہ سے آواز نہ نکلی۔ اتنے میں کسی کے بہت لمبا سانس لینے کی آواز آئی۔ اس کے بدن میں بجلی کی لہر سی دوڑ گئی۔ اس سے ضبط نہ ہوا۔ بستر چھوڑ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ لالٹین کی بتی تیز کی۔ کوٹھری میں چاروں طرف دیکھا وہاں کچھ نہ تھا۔ اس کو یقین ہو گیا کہ باہر سائبان میں کوئی کتا ہے۔ مگر وہ لالٹین لئے ہوئے دروازے کے پاس آئی ہمت کر کے کواڑ کھولے —— ایک قد آور آدمی کھڑا تھا۔ بھاتن کے حلق سے ایک چیخ نکلی —— "چو . . ." اور وہ گر پڑی۔ گھر کے کل لوگ جاگ گئے۔ بھاتن کے پاس جمع ہو گئے۔ دونوں بہوئیں "چور چور" چلانے لگیں۔ مگر پانی برسنے کی آواز میں اُن کی آواز ڈوب کر رہ گئی۔ کسی نے بھی نہ سنا کوئی مدد کو نہ آیا۔ اجنبی سر سے پاؤں تک بھیگا ہوا ایک کونے

میں کھڑا تھا۔ اس کے بدن پر ایک پھٹی ہوئی دھوتی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ وہ سردی سے کانپ رہا تھا ــــ اجنبی عورتوں کے چلّانے سے بھاگا نہیں بلکہ کانپتا ہوا آگے بڑھا۔ اور بغاتن سے ہاتھ جوڑ کر بولا ــــ

" میں چور نہیں ہوں ماں! مصیبت کا مارا ہوں۔ بے پناہ ہوں۔ اب چاہے جو کرو۔۔۔"

بغاتن کے حواس درست نہ تھے۔ وہ کچھ نہ بولی۔ مگر اس کی بہوئیں اور رشتہ کی ایک بہن برابر بکتی رہیں۔ اور اجنبی اُسی طرح ہاتھ جوڑے کھڑا رہا۔ بغاتن کے حواس درست نہ تھے۔ وہ جواب کیا دیتی۔ اجنبی نے کہا۔

"تم لوگ آرام کرو ــــ گھبراؤ مت میں چور نہیں ہوں۔ پانی تھم جائے تو میں چلا جاؤں گا۔۔۔۔۔۔"

بڑی بہو بولی۔

" بدمعاش اب پکڑے جانے کے ڈر سے کہتا ہے۔ چور نہیں ہوں۔ پھر کاہے کو آیا تھا ــــ "

اجنبی بڑی منت کے ساتھ بولا۔

"میں شام ہی سے ایک درخت کے نیچے پڑا تھا۔ مگر جب بہت بھیگ گیا۔ تو چلا آیا۔ تم نہیں چاہتی ہو تو لو میں جاتا ہوں ــــ "

اجنبی کی آواز میں مصیبت کی جھلک تھی سوز کی ملاوٹ تھی۔ وہ اپنا جملہ ختم کر کے آگے بڑھا۔ اب بغاتن کے حواس درست ہو چلے تھے۔ اِس نے کڑک کر پوچھا۔

" اچھا تم چور نہیں تھے تو پکارا کیوں نہیں۔۔۔"

اجنبی نے درد بھری آواز میں کہا۔

"ڈرے ماں —— بڑی مصیبت کا مارا ہوں۔ زندگی میں آج تک کبھی کوئی خوشی نصیب نہیں ہوئی"

بفاتن بولی۔

"تمہارا گھر کہاں ہے؟

اجنبی نے درد بھری آواز میں جواب دیا۔

"گھر ہی ہوتا ماں تو مارا مارا کیوں پھرتا۔ نہ کہیں میرا گھر ہے اور نہ کوئی میرا اپنا ہے۔ دنیا میں کوئی چیز بھی میری نہیں ہے۔ ماں جاؤ۔ آرام کرو میں جاتا ہوں ——"

اپنا جملہ ختم کر کے چپ ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ جن کو اُس نے اپنے ٹھٹھرے ہوئے ہاتھوں سے صاف کیا۔ پھر سائبان سے نیچے اترنے لگا۔ بوڑھی بفاتن کو اپنے بچوں کا خیال آ گیا۔ جو پردیس میں تھے۔ اس کا دل پسیج گیا۔ اس کو اجنبی پر رحم آ گیا۔ اور اُس نے پکار کر کہا۔

"چور ڈاکو نہیں ہو تو جانتے کہاں ہو۔ ٹھیرو آرام کرو۔ ہم لوگ بھی غریب ہیں۔ کچھ کھا پی لو۔ جو ساگ ستو ہو۔ صبح چلے جانا"

اجنبی ٹھہر گیا۔ اُس نے احسان مند نگاہوں سے بوڑھی بفاتن کو دیکھا اور آہستہ سے بولا۔

"تمہارا بیٹا جئے ماں۔ کل سے کچھ نہیں کھایا ہے"

بفاتن کو اجنبی سے غیر معمولی ہمدردی ہو گئی۔ اس کو اپنی کوٹھڑی میں لے آئی۔

اپنی ایک پُرانی سفید ساڑھی دے کر بولی۔

"اچھا اِس کو پہن لو بیٹا ـــــ اے بڑی بہو تھوڑی لکڑی جلا کر لا یہ بیچارہ کانپ رہا ہے۔ اری منجھلی بہو کچھ کھانے کو لا۔"

اجنبی کپڑا بدلنے کے لئے پھر باہر چلا گیا بھیگی ہوئی دھوتی نچوڑ کر ایک ڈوری پر پھیلا دی جو کھچی ہوئی تھی۔ پھر اندر آیا۔

بھاتن نے اپنا پرانا کمبل نکال کر اوڑھنے کو دیدیا۔ وہ اوڑھ کر بیٹھ گیا۔ مگر برابر کانپ رہا تھا۔ بھاتن لالٹین لیکر خود کھانا لینے چلی گئی۔ نہ جانے اسکو اجنبی پر اتنا رحم کیوں آگیا تھا۔

بڑی بہو لکڑی جلا رہی تھی بھاتن کو بڑا اُرا معلوم ہوا۔ اور وہ خود بیٹھ کر لکڑی جلانے لگی ـــــ مگر پھر اُس کو چھوڑ کر منجھلی بہو کی طرف چلی گئی اور اُس سے کھانا لیکر اجنبی کے پاس آئی۔ اور اُس کے سامنے رکھ کر بولی۔

"لے بیٹا کھالے ـــــ"

اجنبی نے کہا۔

"اللہ تم کو اور دیگا ماں ـــــ"

بھاتن دولتمند نہ تھی۔ مگر دال روٹی سے مجبور بھی نہ تھی۔ بوڑھا میاں اور تین بیٹے کلکتہ میں راج مستری کا کام کرتے تھے۔ گاؤں میں چھ سات بگھہ کھیت تھا سب مل ملا کر اتنا تھا کہ زندگی آرام سے گزرتی تھی۔ یہ سب اس کے شوہر نے اپنی کمائی سے حاصل کیا تھا۔ وہ خود غریب گھر میں پیدا ہوئی تھی۔ ماں مر چکی تھی۔ باپ اندھا اور بہرہ تھا، کچھ نہ

کر سکتا تھا۔ گاؤں کے زمیندار کی مہربانی سے دونوں کو صبح شام کھانا مل جاتا تھا وہ تکلیف کو جانتی تھی۔ چھ سال کی عمر سے زمیندار کے گھر میں مزدوری کرتی تھی

اجنبی کھا ہی رہا تھا کہ بڑی بہو نے ٹوٹی ہوئی ہانڈی میں جلتی ہوئی لکڑی لا کر رکھدی۔ اور اجنبی سے دور ہی رکھکر ہٹ گئی۔ بفاتن نے ہانڈی کو اجنبی کے قریب کھسکا دیا۔ جلتی ہوئی لکڑی کے شعلوں کی روشنی میں اُس نے اجنبی کا چہرہ صاف طور پر دیکھا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں نہ دیکھ سکی تھی۔ اُس کی آنکھیں اجنبی کے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ بفاتن کا دل دھک دھک کرنے لگا ——— اور وہ گہرے سوچ میں پڑ گئی۔ اجنبی کھانا ختم کر کے آگ کے قریب ہو کر تاپنے لگا۔ بفاتن سب کچھ بھول گئی تھی۔ اجنبی بولا۔

"کیا سوچ رہی ہو ماں؟ ——— مجھ سے ڈرتی ہو کیا؟ ——— چور نہیں ہوں ماں مصیبت کا مارا ضرور ہوں ———"

بفاتن چونک پڑی اور بولی۔

"نہیں بیٹا ——— تجھ سے ڈر کیسا ——— بیٹے سے کوئی ڈرتا ہے؟"

اجنبی کے مرجھائے ہوئے چہرے پر ہنسی اور رونق کھیلنے لگی۔ لیکن بفاتن کا چہرا اداس ہو گیا۔ اُس کا سفید چہرہ سیاہ دکھائی دینے لگا۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"بیٹا تیرا گھر کہاں ہے؟"

اجنبی کی آنکھوں میں پھر آنسو بھر آئے۔ اس کے چہرہ سے ہنسی اور خوشی غائب ہو گئی۔ وہ درد بھری آواز میں بولا۔

"میرا گھر کہیں بھی نہیں ہے ماں۔ اس لمبی چوڑی دُنیا میں میرا کوئی ہے بھی یا نہیں، مجھے کچھ معلوم نہیں۔ اس تیس برس کی عمر میں مجھے اپنا کوئی نہیں ملا ——— سنو جب میں نے ہوش سنبھالا تو خود کو یتیم خانہ میں پایا۔ وہاں مولوی صاحب سے اپنے بارے میں معلوم ہوا کہ میں پولس کو کمبل میں لپٹا ہوا ملا تھا۔ کوئی میونسپلٹی کے کوڑا ڈالنے کے ایک ٹین میں مجھے پھینک گیا تھا۔ پولس نے تحقیقات کی۔ مگر میرے ماں باپ کا پتہ نہ چلا۔ اور چلتا کیوں؟ اگر مجھے کوئی رکھنا چاہتا تو پھینک کیوں جاتا ——— پولس سے ایک بوڑھے درزی نے درخواست دیکر مجھے لے لیا۔ اس کے کوئی بال بچہ نہ تھا۔ مجھے بیٹا بنا کر پالا جب میں چار سال کا ہوا تو وہ بھی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ پھر میں یتیم خانہ میں رہنے لگا۔ کچھ پڑھا لکھا بھی مگر جس طرح میرا دُنیا میں اپنا کوئی نہیں ہے اُسی طرح میری قسمت میں چین آرام بھی نہیں ہے۔"

اجنبی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بھاتن رونے لگی۔ روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔

اجنبی بولا۔

"تم میرے لئے کیوں روتی ہو ماں! چپ ہو جاؤ۔"

مگر بھاتن روتی ہی رہی۔ اجنبی پھر بولا۔

"تم بڑی رحمدل ہو ماں! آج مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں میری سب کچھ ہو۔ میری ماں بھی ہوتی تو اِسی طرح میری مصیبت پر آنسو بہاتی مجھے اس بُرے حال میں دیکھ کر کڑھتی، کھلاتی پلاتی، کپڑا دیتی اور محبت سے پیش آتی، مجھے تو معلوم ہوتا ہے کہ میری ماں زندہ ہے میں نے اُس کو پالیا۔

بفاتن اُٹھ کھڑی ہوئی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"اُس چارپائی پر سو رہو ——— تم جانا نہیں۔ ماں کہا ہے۔ تو میری بات رکھنا"

اجنبی اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔

"بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے ماں ———"

اجنبی جاکر چارپائی پر سو رہا۔ بفاتن بھی اپنی چارپائی پر لیٹ رہی۔ مگر اس کو نیند نہیں آئی۔ رات بھر اجنبی کی باتیں، اس کی صورت اس کی دردناک کہانی۔ بفاتن کے دماغ میں گھومتی رہیں۔ ہزاروں باتیں اُسکے دماغ میں آئیں اور نکل گئیں۔

دوسرے دِن بفاتن نے اُس سے کہا۔

"بیٹا تم نے ماں کہا ہے۔ تو اس کی لاج رکھو ——— میری زندگی میں کہاں کہاں مارے پھروگے۔ یہ تمہارا گھر ہے۔ رہو کھیتی باڑی کرو میں اپنی زندگی میں تو تمہیں اب نہ جانے دوں گی ———"

اجنبی بولا۔

"نہیں ماں میں اس قابل نہیں"

بفاتن بولی۔

"مگر میں ماں بن کر کہتی ہوں اور تم ہٹ کرتے ہو؟"

اجنبی نے کہا۔

"جب تم ماں بنکر کہتی ہو تو میری مجال نہیں کہ بات نہ مانوں اتنے دنوں کے بعد ماں کی محبت کو جان سکا ہوں۔ اس کو کیسے ٹھکرا سکتا ہوں ــــــ"

اسی دن سے وہ اس گھر کا ایک فرد بن گیا۔ اس کا نام یوسف تھا۔ پہلے تو بفاتن کی بہوؤں کو اس کا رہنا کچھ ناگوار ہوا لیکن بہت جلد ہی یوسف نے اپنے اخلاق سے سب کو اپنا بنا لیا۔ گاؤں کے لوگ بھی اُس سے خوش تھے۔ بفاتن کا شوہر اُس کے بیٹے آئے اور یوسف سے ملکر بے حد خوش ہوئے۔ ہر لڑکا اُس کو اپنا بھائی سمجھتا تھا۔ چونکہ عمر میں سب سے بڑا تھا۔ سب اُس کی عزت کرتے تھے گاؤں کے اکثر لوگ کہتے تھے کہ وہ کوئی شریف آدمی ہے کسی خاص وجہ سے گھر چھوڑ کر بھاگ آیا ہے اور خود کو چھپاتا ہے۔

کچھ دنوں کے بعد بفاتن نے اس کا بیاہ بھی کر دیا۔

ایک دن کسی بات پر گاؤں کے بوڑھے زمیندار نے یوسف کو بلا کر ڈانٹا۔ اس دن بفاتن بہت روئی۔ بفاتن کا چہرہ اترا ہوا دیکھ کر یوسف نے بہت کچھ پوچھا مگر بفاتن نے کچھ نہ بتایا۔ اُسی دن سے وہ برابر اداس رہنے لگی۔ اُس کے چہرے سے رونق غائب ہو گئی۔ کھانا پینا روز بروز کم ہوتا گیا۔ اور ایک مہینہ کے اندر ہی اندر بستر پر ایسی پڑی کہ پھر نہ اُٹھی۔ اُسکے دل کو ایسا جھٹکا لگا کہ وہ برداشت نہ کر سکی۔

دھان کی فصل تیار ہو چکی تھی۔ یوسف اس کی بیوی اور تینوں بہوئیں کھیت پر تھیں بفاتن گھر میں اکیلی پڑی تھی۔ اُس کی صحت ایسی نہ تھی کہ کھیت پر جا سکتی۔ یوسف دھان کا بوجھا کھلیان میں لا رہا تھا۔ اُس کو پیاس معلوم ہوئی۔ پانی پینے گھر چلا گیا۔ بفاتن چارپائی

پڑی تھی۔ اس کی طبیعت زیادہ خراب تھی۔ یوسف اُس کے پاس آگیا۔ بفاتن نے اُسکو پاس بلاکر اس طرح بٹھالیا کہ وہ اس کی گود میں تھا اور بڑی محبت کے ساتھ اُس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر بولی۔

"بیٹا! مجھے ذرا نصیر بابو (بوڑھے زمیندار) کے گھر لے چل۔ بڑا ضروری کام ہے"

یوسف بولا۔

"ماں! تم کہاں جاؤگی، تم اِس قابل نہیں ہو۔"

بفاتن بولی۔

"بلا سے۔ جیسے بھی ہوگا، میں ضرور جاؤں گی۔ یہ مجھے لے چلو"

یوسف مجبور ہو گیا۔ بفاتن بڑی تکلیف کے ساتھ زمیندار کے گھر پہونچی۔ اس وقت وہ اندر تھے۔ بفاتن چلی گئی۔ یوسف باہر ہی رہ گیا۔ بفاتن گھنٹوں اندر بیٹھی نہ جانے کیا کیا باتیں کرتی رہی۔ یوسف بڑا پریشان ہوا۔ ایک تو کھیت پر کام تھا۔ دوسرے بفاتن کی بیماری کا خیال وہ طرح طرح کی باتیں سوچنے لگا۔ پھر خیال آیا کہ کسی سے خبر بھیجے۔ اسی سوچ میں تھا کہ گھر میں سے ایک بوڑھی ماما آئی۔ یوسف نے اُس سے کہا کہ خبر کر دے دیر ہو رہی ہے۔ ماما بڑبڑانے لگی۔ یوسف نے اُس کی خوشامد کی۔ تو وہ چڑ کر بولی۔

"ارے وہ ابھی کیوں آنے لگی۔ مدت کے بعد گئی ہے"

یوسف نے پوچھا۔

کیوں نہیں آئے گی۔ تم جاکر اُن کو خبر کر دو۔"

ماما کو لبفاتن سے نفرت تھی وہ اس سے ہمیشہ سے جلتی تھی۔ جل کر بولی۔

"تجھے کیا معلوم ——— اب بڑی عزت والی بنی ہے بیں جانتی ہوں نا سب کچھ"

یوسف بولا۔

"کیا کہہ رہی ہو تم؟ ......"

بوڑھی ماما بولی۔

"باپ رے باپ کس کی شامت آئی ہے۔ جو بولے کہیں سرکار نے سن لیا۔ تو سر کا ایک ایک بال نوچ لیا جائیگا۔"

یوسف کو شک ہوا۔ کہ شاید لبفاتن کے ساتھ بھی زمیندار نے کچھ بدسلوکی کی، اور اسی لئے وہ اب تک نہ آسکی۔ اس کے دل و دماغ میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا۔ اور وہ گھبرا کر بولا: ———

"تم سرکار سے ڈرتی ہو ——— خدا کی قسم میں کبھی تمہاری کہی بات زبان پر نہ لاؤں گا۔ مگر بتاؤ کہ بات کیا ہے۔ کیا ہوا۔ تم کیا جانتی ہو؟"

بوڑھی ماما بولی۔

تم نیک آدمی ہو۔ اسی لئے تم سے کہے دیتی ہوں۔ لیکن قسم کھاؤ کسی سے نہ کہو گے"

یوسف نے قسم کھالی۔

"خدا کی قسم کسی سے نہ کہوں گا۔ کسی کو معلوم بھی نہ ہونے دوں گا کہ بات کیا ہے۔"

بوڑھی ماما کو معلوم ہوا کہ جیسے اُس کا دل ہلکا ہوا۔ اور وہ رازدارانہ طور پر بولی۔

"اسے یہ بات سوائے میرے کسی کو معلوم نہیں۔ میں نے ہی اُس کی مدد کی تھی۔ اب مجھے پوچھتی بھی نہیں۔ اپنے کو بڑی سمجھتی ہے ——— اسے اس کا باپ اندھا اور بہرہ تھا۔ بے کار تھا۔ لفاتن دربار میں بچپن سے رہتی تھی۔ دونوں باپ بیٹیوں کو کھانا ملتا تھا۔ جب لفاتن جوان ہوئی تو . . . . . . سرکار سے . . . . . اس کا تعلق ہو گیا۔ سرکار علاج کے بہانے اس کو شہر لے گئے۔ میں بھی ساتھ تھی۔ وہاں اس کے بیٹا پیدا ہوا۔ میں اس کو کمبل میں لپیٹ کر میونسپلٹی کے ٹین میں پھینک آئی ——— پولس نے ڈھونڈا۔ ہم لوگوں نے لفاتن کو چھپا دیا ——— پھر معلوم ہوا کہ اس لڑکے کو پولس سے ایک بوڑھے درزی نے لے لیا ——— اسے اس کی سرکار سے پرانی محبت ہے۔ نہ جانے آج بڑھاپے میں اُنکے پاس پھر کیوں آئی ہے چڑیل۔ اگر میں زبان کھول دیتی تو و بھیتی بی لفاتن کا بیاہ کیسے ہو جاتا۔ اور گھر والی بنتیں بدمعاش ہے مکار . . . . . . "

یوسف بوڑھی ماما کا منہ حیرت سے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں غم اور خوشی کے ملے ہوئے آنسو بھر آئے۔ بڑھیا یہ کہکر روانہ ہو گئی۔ یوسف گہرے سوچ میں پڑ گیا اس کا دل دھک دھک کرنے لگا ———

اتنے میں بوڑھی لفاتن اندر سے نکلی۔ اس کے ساتھ زمیندار تھے۔ زمیندار یوسف کو دیکھ کر معنی خیز ہنسی ہنسے۔ یوسف نے گردن نیچی کر لی۔ اور لفاتن کو لیکر گھر چلا آیا۔

گھر پہنچکر وہ چارپائی پر بیٹھنا ہی چاہتی تھی کہ یوسف نے روکر لطافتن سے کہا۔

"اتنے دن سے حقیقت کو کیوں چھپایا تھا میری ماں !!"

معلوم ہوا جیسے لطافتن پر بجلی گر پڑی۔ وہ خود کو نہ سنبھال سکی ——— چکرا کر گر پڑی۔ اُس کا سر چارپائی کی پٹی پر پڑا۔ سر پھٹ گیا۔ خون بہہ نکلا ——— وہ بے ہوش ہوگئی۔ یوسف نے خون روکنے کی کوشش کی مگر بیکار۔ وہ گھر سے باہر بھی نہ جا سکتا تھا کہ دوسروں کو مدد کے لئے بلائے۔ اُس کی حالت عجیب سی ہوگئی گھنٹوں کے بعد ہوش آیا۔ اُس نے آنکھیں کھولیں اور یوسف کو دیکھ کر بولی۔

"بیٹا! بیٹا !!"

پھر بے ہوش ہوگئی۔ دو چار بار ایسا ہی ہوا۔ اس درمیان میں گھر کے دوسرے لوگ بھی کھیت سے آگئے۔ یوسف نے کپڑا جلا کر زخم پر رکھا۔ خون بند بھی ہوگیا۔ مگر کمزور اور بیمار لطافتن کے بدن سے خون اتنا بہہ چکا تھا کہ وہ سنبھل نہ سکی۔ ایک بار اُس نے پھر آنکھ کھولی۔ چاروں طرف نظر گھما کر سب کو دیکھا۔ اور یوسف کو دیکھ کر آخری مرتبہ بولی

"بیٹا! بیٹا !! میرا لال !!!"

پھر اُس کی آواز کم ہوتی گئی۔ اور پھر ہمیشہ کے لئے چپ ہوگئی ٭

جوار بھاٹا

بھادوں کا مہینہ تھا۔ رات کے دو بج چکے تھے موسلا دھار پانی برس رہا تھا کملا ناتھ بابو اب تک ضروری کاغذات دیکھ رہے تھے۔ وہ ہاتھ میں قلم لئے کرسی پر بیٹھے تھے میز پر بجلی کا لیمپ جل رہا تھا۔ اور سامنے کاغذات کا انبار بکھرا پڑا تھا۔ پاس ہی مسہری پر اُن کی بیوی پدما سوئی ہوئی تھی —— یکایک بجلی چمکی بادل کڑکا اور سارا کمرہ روشن ہو گیا کملا بابو کی آنکھیں چوندھیا سی گئیں لیمپ کی روشنی ماند پڑ گئی —— مسہری پر پدما کانپ سی گئی۔ وہ بیتابی کے ساتھ بانہہ پھیلا کر ذرا کھسکی۔ مگر اس کا ہاتھ مسہری کی خالی جگہ پر پڑا۔ ایک بار اس نے آس پاس ٹٹولا مگر وہاں کچھ نہ تھا۔ خوف سے اس کی نیند اچاٹ ہو گئی۔ اُس نے کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔ کملا بابو اپنے خیال میں ڈوبے ہوئے تھے۔ پدما نیند میں ڈوبی ہوئی

آواز میں بولی۔

"اوہ آپ اب تک کام کر رہے ہیں؟"

کملا بابو نے اُس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

"ہاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"اب آئیے سو جائیے رات بہت زیادہ جا چکی۔"

"تم سو جاؤ۔ ابھی بہت سے کاغذات باقی ہیں۔"

کمرے میں پھر سناٹا چھا گیا۔ کملا بابو کاغذات دیکھتے ہی رہے۔ پانی اب بھی برس رہا تھا۔ سوائے پانی برسنے کے اور کسی قسم کی آواز سنائی نہ پڑتی تھی۔ دوسرے کمرے سے ڈھائی بجنے کی آواز آئی لیکن کملا بابو ہلے تک نہیں۔ وہ اپنا کام کرتے ہی گئے۔ پھر گھڑی نے تین بجائے۔ اُنہوں نے جلدی جلدی کاغذات کو ترتیب دے کر میز پر رکھا، اور کرسی سے اُٹھے۔

پدما اب تک جاگ رہی تھی۔ اُس کی نیند ٹوٹی تو پھر وہ نہ سو سکی۔ وہ سینہ کے نیچے ایک تکیہ دبائے۔ دونوں ہتھیلیوں پر رخسار رکھے کملا بابو کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں شکایت کی ایک لمبی کہانی چھپی تھی۔ کملا بابو مسہری پر آ کر بیٹھ گئے۔ پدما بولی۔

"آپ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

کملا بابو نے بات کاٹ کر کہا۔

"اب باتیں کرنے کا وقت نہیں رہا۔ تین بج گئے ہیں۔ سو جاؤ۔ مجھے چھ بجے اُٹھنا ہے۔"

پدما چپ ہو گئی۔ سوچنے لگی یہ کیسے آدمی ہیں۔ مشین کی طرح بے حس۔ دن رات کام کرتے

ہیں۔ ان کے دل میں لطیف احساس کی کبھی کوئی لہر نہیں اُٹھتی۔ اپنی صحت کا بھی ذرا خیال نہیں۔ کملا بابو کی صحت کا خیال آتے ہی وہ پھر بولی۔

"میں آپ . . . . ."

کملا بابو نے پھر بات کاٹ دی اور بولے۔

"اس وقت سو جاؤ۔ بات کرنے کا اب وقت نہیں ——"

اتنا کہہ کر وہ مسہری سے اُٹھے میز کے پاس آئے۔ ٹائم پیس کی جگاؤنی گھنٹی لگائی۔ بجلی کا بٹن دبا کر ایک ہلکے سبز رنگ کا بلب روشن کر دیا اور میز والا بلب بجھا دیا۔ سارے کمرے میں دھیمی دھیمی سبز روشنی پھیل گئی۔ وہ مسہری پر لیٹے، ریشمین چادر سر سے پاؤں تک تان کر سو رہے۔

پدماسوچنے لگی کس آدمی کا میرا ساتھ ہوا، بیاہ ہوتا ہے ایک دوسرے کا جیون ساتھی بنانے کیلئے۔ میرا بھی بیاہ اسی لئے ہوا تھا، پر قسمت نے ملایا تو ایسے آدمی سے جو سوکھی لکڑی سے بھی زیادہ بے لیس ہے۔ بیاہ کو تین سال ہو گئے کبھی ایک گھنٹہ بیٹھکر ایسی باتیں نہ کیں جس سے دل خوش ہو جائے جب سامنے آئے تو چہرہ اترا ہوا، فکر سے چہرہ اداس۔ کچھ پوچھا تو جواب ملا "کاروبار کی حالت اچھی نہیں۔ دو لاکھ کا ایک آرڈر ملنے والا ہے اس کی فکر میں ہوں —— کل یکایک بازار گر گیا، ورنہ اس کام میں پچاس ہزار کی بچت ہو جاتی۔ صرف بیس ہزار ملے۔ اس طرح تیس ہزار کا گھاٹا ہو گیا" اور اسی طرح کی سوکھی باتیں۔ جب مجھے اداس دیکھا تو آفس سے آتے وقت کوئی زیور خرید تے لائے۔ یا کوئی دوسری اچھی چیز۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجھے صرف زیور اور چیزوں کی بھوکی سمجھتے ہیں۔

پدما کا دل بیٹھنے لگا۔ اُس نے درد اور شوق بھری نظروں سے کملا بابو کو دیکھا۔ وہ سر سے پاؤں تک سفید ریشمیں چادر میں لپٹے پڑے تھے۔ وہ اُن کے چہرے کو بھی نہ دیکھ سکی اُس کے دل میں تراس کی ایک تیز لہر دوڑ گئی۔ اُس نے اپنا چہرہ تکیہ میں چھپا لیا۔ اُس کا دل بیٹھنے لگا۔ بے اختیار دل بھر آیا۔ مگر اُس نے اپنے اُبھرتے ہوئے جذبات کو کوشش کر کے دبا یا۔ شاید کملا بابو کی نیند اُچٹ نہ جائے، اُنہیں سویرے ہی اُٹھنا تھا۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ وہ اپنے جذبات کو جتنا زیادہ دبانے کی کوشش کرتی، وہ اُتنا ہی زیادہ اُبھر رہے تھے۔ اُس کو اپنی پچھلی زندگی کے آزاد دن سہانے خواب کی طرح یاد آ رہے تھے۔ وہ بے چین ہوتی جا رہی تھی ——— آخر اِسی حالت میں وہ سو گئی۔

چھ بجتے ہی گھڑی نے جگا دینی گھنٹی بجانی شروع کر دی۔ کملا بابو مسہری سے انگڑائی لیتے ہوئے اُٹھے۔ دیوار کے قریب جا کر ایک بٹن دبایا، جس سے نوکروں کے کمرے میں گھنٹی بجنی شروع ہو گئی۔ پھر وہ غسل خانہ میں چلے گئے، جس کا دروازہ سونے کے کمرے میں ہی کھلتا تھا۔ تھوڑی دیر میں پدما بھی اُٹھ بیٹھی اس کا چہرہ اداس تھا۔ تھوڑی دیر تک بیٹھی وہ کچھ سوچتی رہی، پھر اُٹھی۔ غسل خانے کا دروازہ بند دیکھ کر وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی ——— جب وہ مُنہ ہاتھ دھو کر کمرے میں واپس آئی تو کملا بابو کمرے میں نہ تھے۔ وہ آئینہ کے سامنے کھڑی ہو کر بال سنوارنے لگی۔ اتنے ہی میں پردے کے پیچھے سے نوکر نے آ کر آواز دی۔

"آ سکتے ہیں حضور؟"

"آؤ —————"

پدما بولی۔ نوکر نے آتے ہی جھک کر سلام کیا۔ اور بولا۔

"صاحب چائے پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں"

وہ کپڑے سنبھالتی ہوئی کھانے کے کمرے میں چلی گئی۔ کملا ناتھ وہاں بیٹھے تھے۔ کپڑے پہن کر تیار تھے۔ اُن کے چہرے پر فکر اور تردد کا گہرا سایہ تھا۔ پدما جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ کملا بابو نے نوکر سے کہا۔

"ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کے لئے کہا۔

پدما نے توس میں مکھن لگا کر کملا بابو کی پلیٹ میں رکھا۔ پھر چائے بنانے لگی۔ چائے کی ایک پیالی کملا بابو کی طرف بڑھا کر دوسری پیالی بناتے ہوئے اس نے کملا بابو کی طرف اس امید کے ساتھ دیکھا کہ شاید وہ کچھ بولیں۔ مگر وہ چپ چاپ بیٹھے تھے۔ آخر اُس نے کہا۔

"آپ اتنے فکر مند کیوں معلوم ہوتے ہیں؟"

"کاروبار کی حالت اچھی نہیں"

کملا بابو نے پدما کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ پھر چائے پینے لگے۔ پدما کو اس کی امید بالکل نہ تھی۔ اس کے دل کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس نے کملا بابو کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے دونوں توس ختم کر چکے تھے۔ چائے کی پیالی اُن کے لب سے قریب رُکی ہوئی تھی۔ اور وہ پھیلی پھیلی نگاہوں سے دیوار کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پدما نے کہا۔

"میں آج اپنی بہن کے یہاں جانا چاہتی ہوں۔ اکیلے میری طبیعت گھبراتی ہے"

"نہیں" کملا بابو نے اُس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ "آج نہیں، دو چار دن بعد چلی جانا۔ مجھے بھی باہر جانا ہے۔"

پدما کچھ اور بولنا چاہتی تھی۔ لیکن کملا بابو اُٹھے اور باہر چلے گئے۔ پدما چپ چاپ بیٹھی دروازے کی طرف دیکھتی رہی۔ بالکل خالی نظروں سے اس کا دماغ بھی خالی تھا ـــــ جب کملا بابو نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ تو اُس نے چائے کی پیالی رکھدی اور کمرے میں چلی آئی نڈھال ہو کر مسہری پر گر پڑی اور سوچنے لگی۔

بیاہ کو تین سال ہو نے مگر کوئی خوشی نصیب نہ ہوئی کبھی ہنس کر نہ بولے عجیب آدمی ہیں سمجھتے ہیں کہ اس شاندار کوٹھی، موٹر، کپڑے اور زیور سے میں خوش ہوں مجھے اور کسی چیز کی چیز کی ضرورت نہیں ہیں اُنہیں کس طرح بتاؤں کہ پدما دولت، آرام اور آسائش سے زیادہ آپ کی محبت کی پیاسی ہے۔ دن رات کڑھ کڑھ کر کٹتا ہے۔ چہرے سے ہنسی اور خوشی کے نشان بھی مٹ گئے ہیں مگر کبھی نہ پوچھا کہ تیرا چہرہ میلا کیوں ہے؟ بس دن رات ایک دھن ہے۔ روپیہ، روپیہ۔ مجھ سے زیادہ روپیہ کی فکر ہے۔ پھر میری زندگی برباد کرنیکی ضرورت کیا تھی۔ لوگ کہتے ہیں۔ دولت سے آرام ملتا ہے۔ یہ دولت تو میرے لئے مصیبت بن گئی۔ دن رات بس روپیہ کی فکر ہے۔ آرام کی فکر میں تکلیف اُٹھائی جا رہی ہے یہ سو طرح کی تکلیف، زندگی کیلئے مشین بن کر رہ گئی ہے۔ جو دن رات چلتی رہتی ہے۔ بیاہ کے بعد تین سال سینے پر پتھر رکھ کر اور سارے ارمانوں کو کچل کچل کر زندگی کے دن کاٹے۔ مگر اس طرح کب تک کٹے گی۔ اُن کے سینے میں تو دل نہیں پتھر کا ٹکڑا ہے۔ مگر میں دل کو پتھر کا ٹکڑا کس طرح بنا لوں۔ اُن کا

دل تو روپیہ کی محبت میں دیوانہ ہو رہا ہے۔ مگر میرا دل تو اُن کی محبت میں دیوانہ ہو رہا ہے وہ بے فکر ہیں میں کس طرح بے پروا ہو جاؤں؟

پدما دیر تک اسی قسم کی باتیں سوچتی اور روتی رہی لیکن اُس کی سمجھ میں یہ نہ آیا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ وہ اُٹھی اور بہن کو ایک خط لکھنے لگی وہ چاہتی تھی کہ اپنا دل کھول کر بہن کے سامنے رکھدے۔ مگر اس کا دماغ کام نہ کر رہا تھا۔ ایک گھنٹے سے زیادہ کاغذ قلم دوات لئے بیٹھی رہی۔ لیکن مشکل سے چند سطریں لکھ سکی۔ اتنے میں کملا ناتھ واپس آ گئے۔ پدما نے کاغذ کو میز کی دراز میں رکھدیا، اور کرسی چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

کملا ناتھ نے آتے ہی کہا۔

"ذرا کھانا منگوالو۔ گیارہ بجنے والے ہیں۔ اور پونے بارہ کی ٹرین سے باہر جانا ہے۔

پدما کمرے سے نکل کر برآمدے کی طرف بڑھی۔ کملا ناتھ نے اُسے پکار کر کہا۔

" اور ہاں سنو۔ آج دو بجے کی ٹرین سے رمیش بابو آ رہے ہیں۔ وہ دو چار دن یہاں ٹھہریں گے میرے پیچھے اُنہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ میں دو ہی چار دنوں میں واپس آ جاؤنگا"

کملا ناتھ کہاں گئے تھے پدما کو بالکل معلوم نہ تھا۔ رمیش بابو اسی دن آ گئے۔ ان کا تار آ چکا تھا۔ وہ کملا ناتھ کے بچپن کے دوست تھے۔ اور ایک بار پہلے بھی آ چکے تھے۔ پدما اُنہیں جانتی تھی۔ بہت خوش مزاج آدمی تھے۔ لگاتار گھنٹوں ہنستے اور ہنساتے رہتے تھے۔ ان کی ہر بات اچھی تھی۔ ابتک اُنہوں نے بیاہ نہیں کیا تھا۔ اس کی دو وجہیں تھیں۔ ایک تو اُنہیں برابر باہر

رہنا ہوتا تھا۔ دوسرے وہ ڈرتے تھے کہ بیوی مزاج کے مطابق نہ ملی تو اور بھی مصیبت ہوگی۔

جس وقت سے وہ آئے پدما کو ہنساتے رہے۔ وہ بات ہی ایسی کرتے تھے کہ آدمی ہنستا رہے لیکن کبھی کبھی رمیش بابو کی خوش مزاجی کے ساتھ کملا ناتھ کی سوکھی طبیعت کا احساس ہو جاتا تو اس کو بڑی حسرت ہوتی۔ اس کا دل جھک جاتا اور چہرہ میلا پڑ جاتا اور دل ہی دل میں کہتی "وہ عورت بڑی خوش نصیب ہوگی، جسے رمیش بابو جیسا شوہر ملے گا۔"

ایک بار ناشتے کے وقت کچھ ایسی ہی ہنسی کی بات ہوگئی۔ پدما اور رمیش بابو خوب ہنسے لیکن ہنستے ہنستے پدما کو کملا ناتھ یاد آ گئے۔ اور ان کے ساتھ ہی اُن کی بے پروائی اس کے دل میں ایک ہوک سی اُٹھی اور دل بھر آیا۔ ضبط کرنے پر بھی اُس کے آنسو نکل آئے۔ رمیش بابو نے فوراً ہی وجہ دریافت کی اور ہنسانے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن پدما دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

پدما۔ رمیش بابو کو جتنی بار دیکھتی تھی۔ اُن میں دلکشی زیادہ پاتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اُن کے سامنے نہ جائے لیکن ایک تو اس لئے کہ وہ مہمان تھے۔ دوسرے خود اس کا دل بھی چاہتا تھا کہ اُن سے باتیں کرے۔ اُن کی باتوں میں اُسے لطف آتا تھا۔ اس مرتبہ وہ آئی تو اُس نے فیصلہ کر لیا کہ صرف دو چار منٹ اُنکے پاس ٹھہرے گی۔ رمیش بابو دو دن سے اُس کے ساتھ تھے مگر اسی دو دن میں وہ ان سے بہت نزدیک اور کملا ناتھ سے دور ہو گئی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد رمیش بابو نے کمرے کے باہر سے پدما کو آواز دی۔ اُس نے کمرے میں بلا لیا۔ دو چار ہی منٹ میں پدما کا دل تازہ ہو گیا۔ اُس نے شرارت سے سوال کیا۔

"رمیش بابو آپ بیاہ کب تک کریں گے۔۔؟"

"آپ کو اِس کی کیا فکر ہے؟" رمیش نے جواب دیا۔ "آخر آج یہ نیا سوال کیسے ہو گیا؟"

پدما نے کہا۔

"آخر کب تک اکیلی زندگی گزار دیگا؟"

"بات یہ ہے" رمیش بابو بولے۔ "بیاہ کرنے کا مطلب ہے ایک جیون ساتھی ڈھونڈ کر لانا۔ اگر یہ جیون ساتھی اچھی نہ ملی تو میری زندگی ہی برباد ہو جائے گی۔"

پدما کو اپنی بے لطف زندگی کا احساس ہوا۔ اس کا دل بھر آیا۔ مگر اُس نے دل پر جبر کر کے ضبط کیا۔ پھر بناوٹی ہنسی کے ساتھ بولی۔

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسی شک کے پھیرے میں آدمی بیاہ کرے ہی نہیں۔"

"ہاں میرا تو یہی خیال ہے۔ ہر آدمی کملانا تھ جیسا خوش نصیب نہیں ہوتا کہ اُسے آپ جیسی بیوی مل جائے۔"

پدما کے دل پر جیسے کسی نے تان کر گھونسہ مار دیا۔ اور وہ ضبط کی کوشش کرنے پر بھی کامیاب نہ ہوئی۔ رو پڑی۔ رمیش اُسے دلاسا دے کر خوش کرنے کی کوشش کرنے لگے مگر بے فائدہ۔ طرح طرح سے رمیش بابو نے سمجھایا۔ اس کے جواب میں وہ صرف اتنا کہہ سکی۔

"آپ کو کیا معلوم کہ میری زندگی کس طرح کٹتی ہے۔"

رمیش بابو نے ہمدردی کے ساتھ کہا۔

"مجھے معلوم ہے کہ کملا ناتھ میں ہیرے اور کھوٹے پتھر میں تمیز کرنے کی صلاحیت نہیں۔"

کچھ دیر کے بعد رمیش بابو اُٹھ کر چلے گئے۔ پدما ان کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتی رہی۔

اور سوچتی رہی - کاش کملاناتھ بھی ایسے ہی خوش مزاج ہوتے۔ مگر اُس نے سوچا کہ ہر آدمی کا مزاج ایک سا ہو ہی نہیں سکتا۔ اُسے خیال آیا۔ کاش اس کا بیاہ کملاناتھ کے بدلے رمیش بابو سے ہوتا۔ لیکن اب کیا ہو ـــــــ یہ اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔

دیر تک وہ بہت سی باتیں سوچتی رہی۔ اسی سلسلے میں اُسے رمیش بابو کی ایک بات یاد آگئی "کملاناتھ کو ہیرے اور کھوٹے پتھر میں تمیز کرنے کی صلاحیت نہیں" اُسے یقین ہو گیا کہ کملاناتھ کے دل پر کسی اور کا قبضہ ہے۔ یہ خیال آتے ہی اس کا دل ٹوٹ گیا۔ اور کملاناتھ کی طرف سے ہمیشہ کے لئے مایوس ہو گئی۔ اور اُس نے فیصلہ کر لیا کہ رمیش سے اپنے دل کا سارا حال کہہ دے گی۔ اور اُس سے کہے گی کہ اس کی برباد ہوتی ہوئی زندگی کو بچالے۔

رمیش ناشتہ کر کے باہر گئے تھے۔ وہ بے چینی کے ساتھ اُن کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے عالی شان کوٹھی خوفناک بھوت کا منہ معلوم ہوتی تھی جس میں زہریلے سانس کی گرمی سے اپنے کو گھلتی ہوئی محسوس کر رہی تھی۔ وہ سوچ چکی تھی کہ اپنا سر رمیش بابو کے پاؤں پر رکھ دے گی۔ گیارہ بج گئے۔ رمیش واپس نہ آئے۔ وہ بے چینی کے ساتھ بار بار دروازے کی طرف دیکھتی تھی۔ اُسے بار بار خیال آتا تھا کہ رمیش بابو بھوکے ہوں گے۔

پدما کے دل کا عجیب حال تھا۔ اُسے رمیش بابو کی ہنسی، اُن کی باتیں یاد آ رہی تھیں کملاناتھ کو وہ بالکل بھول چکی تھی۔ اُن کے لئے اس کے دل میں اب کوئی جگہ نہ تھی۔ اتنے میں نوکر نے آکر ایک رجسٹری لفافہ دیا۔ پدما نے دستخط کر کے لفافہ لے لیا۔ کھولا اور خط پڑھنے لگی۔ یہ خط کملاناتھ کا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا۔

پیاری پدما۔

تمہارے بغیر میری طبیعت یہاں نہیں لگ رہی ہے میں نے اکثر تمہارا میلا چہرہ دیکھا تمہاری آنکھوں میں مایوسیوں کی لمبی کہانی دیکھی۔ پر میں نے کبھی پروا نہ کی لیکن یہاں تم بہت یاد آرہی ہو۔ رات میں نے سب کچھ محسوس کیا۔ اب کل کام ہو یا نہ ہو۔ میں یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ اور اب تمہیں مجھ سے کسی قسم کی شکایت نہ ہو گی۔

کملاناتھ

پدما نے خط کو پڑھا تو خوشی سے اس کا دل جھوم اُٹھا۔ کملاناتھ میں ساری خوبیاں اُسے نظر آنے لگیں۔ اُس نے خط کی تاریخ دیکھی۔ اور حساب لگایا۔ اسی دن وہ آنے والے تھے اُس کو سارا گھر جھومتا معلوم ہوا۔ اتنے میں رمیش بابو باہر سے آگئے۔ مگر پدما کے دل پر کملاناتھ کا پھر قبضہ ہو چکا تھا۔ رمیش بابو نے پدما کو مسکرا کر دیکھا۔ اور پوچھا۔

"کس کا خط ہے؟"

لیکن پدما کو اُن کی ہنسی میں کوئی کشش نظر نہ آئی۔ اور اُس نے خوش ہو کر کہا۔

"رمیش بابو۔ آپ کے دوست آج ہی آنے والے ہیں۔" ؂

چوکیدار

رات کو جب گاؤں کے سب چھوٹے بڑے چین کی میٹھی نیند سوتے تو رام لال چوکیدار
کندھے پر اپنی پرانی لاٹھی لیکر جھونپڑے سے باہر نکل آتا، اور گاؤں کی اندھیری گلیوں میں پھر
کرتا کہ کہیں کوئی چور تو نہیں، تھوڑی دیر پر وہ چلّا اٹھتا "جاگ کے سونا" اس کی آواز
بڑی ڈراؤنی تھی۔ کبھی کبھی رات کو اس کی آواز سن کر بچے ماں سے لپٹ جایا کرتے تھے کبھی اسکی
آواز سے کسی کی نیند اچٹ جاتی تو اس کو غصہ آتا کہ ہر رات یوں ہی چیختا ہے۔ نہ چور، نہ چور
کا سایہ۔ خواہ مخواہ نیند خراب کرتا ہے۔

گاؤں کے کنارے مٹی اور پھوس کا ایک جھونپڑا تھا، یہی رام لال چوکیدار کا گھر تھا۔ گھر میں
آٹھ سال کی ایک یتیم پوتی تھی، اور بس اللہ کا نام بیس سال سے گاؤں میں چوکیداری کرتا

تھا چھ روپیہ مہینہ ملتا تھا یہی اسکا سب کچھ تھا۔ اور اسی میں وہ خوش تھا۔ پوتی سے اسکو بہت محبت تھی لیکن جب اس کی گشتی کا وقت آتا تھا تو وہ اُس کو جھوپڑی میں اکیلا چھوڑ کر گشت کرنے کے لئے چلا جاتا۔ لڑکی اکیلے ڈرتی تھی لیکن وہ اپنے فرض کو نہ بھولتا پانی برسے یا طوفان آئے کیا مجال کہ رام لال گشت نہ کرے۔ کبھی کبھی لوگ اُس کو سمجھایا کرتے۔ کہ رات بھر پھرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک دو بار پھر کر دیکھ لو لیکن رام لال جواب دیتا مجھے تنخواہ اسی کی ملتی ہے بیس سال کی مدت میں کبھی بھی ایسا نہ ہوا کہ رام لال نے گاؤں میں گشت نہ لگائی ہو کڑاکے کے جاڑے میں بھی وہ بستر کو چھوڑ کر ٹھنڈی ہوا میں ٹھٹھرا کرتا تھا۔ لیکن اپنے فرض کو کبھی نہ بھولتا۔

آس پاس کے چوروں کو رام لال کے نام سے نفرت تھی بسب کے سب اس کے دشمن تھے دو تین مرتبہ دو چار نے مل کر اس پر حملہ بھی کیا۔ لیکن رام لال خود طاقتور تھا۔ کچھ دیر تک انکا مقابلہ کرتا رہا۔ پھر لوگوں کو مدد کے لئے بلایا اور چور اُس کو مار بھی نہ سکے۔ سب اس کے مرنے کی دعائیں مانگا کرتے تھے لیکن اُس گاؤں کی طرف منہ نہ کرتے۔

گاؤں کے زمیندار رام نرائن بابو کے بڑے بیٹے رام چندر بابو ڈپٹی مجسٹریٹ ہوئے۔ رام لال کو بڑی خوشی ہوئی کہ اُس کے زمیندار کے بیٹے ڈپٹی ہو گئے۔ اب اُس کی حالت یہ تھی کہ وہ سر اٹھا کر چلتا تھا جب تھانہ میں حاضری دینے کو جاتا تھا تو دوسرے چوکیداروں سے خود کو بڑا سمجھتا۔ کیونکہ اُس کے زمیندار کے بیٹے ڈپٹی تھے اور دوسروں کے نہیں۔ وہ نہایت ہی فخر کے ساتھ لوگوں سے کہا کرتا "ڈپٹی صاحب تو میری گود کے کھلائے ہوئے ہیں۔ اب میں

دفعدار ضرور ہو جاؤں گا۔" دوسرے چوکیدار اس کی باتوں کو سنتے اور ایک سانس لیکر رہ جاتے تھے۔ سب کو یقین تھا کہ رام لال ضرور دفعدار ہو جائیگا۔

ڈپٹی صاحب درگا پوجا کی چھٹیوں میں گھر آئے۔ رام لال نے اپنی وردی نکالی اور پہنکر سیدھا ڈیوڑھی پر پہنچا۔ ڈپٹی صاحب گھر میں تھے۔ رام لال باہر بیٹھا رہا۔ اسکی خوشی کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ اسکا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ڈپٹی صاحب آئینگے میں انکو اس طرح سلام کرونگا، وہ مسکرا کر جواب دینگے اور پوچھیں گے "کیسا ہے؟" میں کہونگا "سرکار کی کرپا ہے" ڈپٹی صاحب ہنس دینگے۔ رام لال اس خیال ہی سے خوش ہوگیا جیسے اسکو بہت بڑی دولت مل گئی۔ بڑے کی مہربانی کیسا تھا ایک ہنسی ہی غریب کیلئے بہت بڑی دولت ہے۔ رام لال انہی خیالوں میں بیٹھا رہا اور گھنٹوں گزر گئے۔ پٹواری صاحب نے کہا

"ارے وہ ابھی تھکے آئے ہیں سو گئے ہونگے۔"

رام لال بولا "جب وہ سو کر اٹھیں گے تب ہی میں بھی جاؤں گا۔ آ گیا ہوں تو بغیر حاضری دیئے کیسے جاؤں؟"

پٹواری جی اپنے کاموں میں لگ گئے اور رام لال اپنے خیال میں مست بیٹھا رہا۔ صبح کے وقت آیا تھا، شام ہونے کو آئی تو ڈپٹی صاحب گھر سے باہر آئے۔ رام لال نے جھک کر سلام کیا۔ ڈپٹی صاحب نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ایک معمولی چوکیدار کے سلام کا جواب کیسے دیتے۔ وہ سمجھے کہ شاید کچھ انعام مانگنے آیا ہے۔ رام لال کھڑا ہی رہا کہ شاید اب وہ کچھ بولیں لیکن ڈپٹی صاحب نے اسکی طرف دیکھا تک نہیں اور اپنے چند رشتہ داروں کے ساتھ باتیں کرنے لگے۔ رام لال اس امید میں بیٹھا رہا کہ اب انکی بات

ختم ہوگی۔ اور ڈپٹی صاحب میری طرف دیکھیں گے اور باتیں کریں گے۔ ڈپٹی صاحب دوسروں سے باتیں کر رہے تھے۔ لیکن رام لال خوشی میں یہ سمجھ رہا تھا کہ ڈپٹی صاحب اسی سے باتیں کر رہے ہیں۔

جب اُنکے رشتہ دار چلے گئے تو ڈپٹی صاحب اُٹھے اور باہر آئے۔ رام لال نے پھر جھک کر سلام کیا۔ اب ڈپٹی صاحب کھڑے ہو گئے۔ اور رام لال اُنکے ہونٹ کو دیکھنے لگا کہ اب ہلیں۔ اب ہلیں۔

ڈپٹی صاحب نے بڑے سوکھے طور سے کہا۔ "کیا مانگتا ہے؟"

رام لال کا دل بڑھ گیا اور خوش ہو کر بولا: "حضور حاضری دینے آئے تھے۔"

ڈپٹی صاحب بولے۔ "دیکھ لیا، تم زندہ ہے، جاؤ اب۔"

رام لال سلام کر کے سر جھکائے واپس چلا آیا۔ اُس کو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے اُسکے دل میں چھری بھونک دی۔ اس کو وہ وقت یاد آگیا جب رام چندر بابو اُس سے کہا کرتے تھے "رام لال طوطا کا بچہ لادو" اور کہتے تھے "جب ہم ڈپٹی ہونگے تو تم کو اپنا چپراسی بنائیں گے" اُس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اُسکے دل میں اس کے سوا اور کوئی آرزو نہ تھی کہ ڈپٹی صاحب اس سے مسکرا کر ایک جملہ کہدیں۔ لیکن وہ یہ سمجھا کہ اس میں میری ہی کوئی خطا ہے معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے شکایت کر دی ہے کہ رام لال گشت نہیں کرتا۔ اسی وجہ سے ڈپٹی صاحب خفا ہو گئے۔

رات ہوتی سب لوگ سو گئے رام لال اپنے گھر سے لاٹھی لیکر نکلا اور گشت لگانے چلا گیا۔ اس کی اکلوتی پوتی کی طبیعت خراب تھی۔ رام لال دن بھر غائب رہا اور بھوک سے روتی رہی تھی۔ مگر رام لال کو اس کی بیماری کا خیال نہ ہوا۔ گھر سے نکل پڑا۔ گاؤں میں پہنچکر ایک بار کڑک کر اُس نے زور سے آواز دی "جاگ کے سونا" اور آگے بڑھ گیا۔ تھوڑی دور جا کر پھر آواز دی

اور آگے بڑھیا گیا۔ اسی طرح آواز دیتا۔ گاؤں کا گشت لگا کر واپس آیا۔

ایک گھنٹہ بعد پھر نکل کھڑا ہوا اور سارے گاؤں کا چکر کاٹ کر واپس آیا اور اسی طرح رات بھر چکر لگا تا رہا۔ وہ سمجھ رہا تھا۔ کہ اب ڈپٹی صاحب ضرور خوش ہو جائیں گے۔ اگر کسی نے شکایت کر دی ہوگی تو اُن کا غصہ ختم ہو جائیگا۔ اسی طرح کے دل خوش کرنے والے خیالوں میں مگن ہو کر سو رہا۔

صبح ہوئی، اُٹھا منہ ہاتھ دھو کر بیٹھا ہی تھا۔ کہ زمیندار کا پیادہ آیا اور بولا۔

"تمہیں ڈپٹی صاحب بلاتے ہیں"

رام لال خوش ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا اُس کو بڑی خوشی تھی کہ آخر ڈپٹی صاحب نے بلایا۔ رات کو پہرہ دیا ہے اس سے وہ خوش ہو گئے، ضرور کسی نے شکایت کی تھی اسی لئے رنج تھے۔ رام لال جھونپڑی کے اندر گیا اور اپنی پھٹی ہوئی پگڑی سر میں لپیٹ لی، ہاتھ میں لاٹھی لیکر پیادہ کے ساتھ چل پڑا۔

زمیندار کے بنگلہ پر آیا تو ڈپٹی صاحب سامنے ہی کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ رام لال نے باری باری سب کو جھک جھک کر سلام کیا۔ ڈپٹی صاحب نے دیکھتے ہی گرج کر کہا:۔

"تم بوڑھا ہو گیا مگر بالکل گدھا ہے۔ رات بھر کاہے کو چلاتا پھرتا ہے۔ کوئی ڈاکو تھوڑا ہی بیٹھا ہے"

رام لال بولا۔ "سرکار ہم تو روز پہرہ دیتے ہیں"

ڈپٹی صاحب نے ڈانٹ کر کہا۔ "ہاں پہرہ دیتا ہے۔ پاگل کہیں کا، رات کو سونے

نہیں دیتا۔ جبر دا جو آج سے آواز سُنی۔ گھر میں سو یا کیوں نہیں رہتا؟"

رام لال سر جھکائے گھر چلا گیا۔ اس کا دل بہت کڑھا ہوا تھا، پھر بھی اپنے کاموں میں لگا رہا غریب کو کام سے کب چھٹی ہوتی ہے۔ اس رات سے رام لال نے گاؤں میں گھومنا بند کر دیا۔ کسی نے اس کی آواز نہ سنی۔

ہونیوالی بات، دو چار دنوں کے اندر ہی ڈپٹی صاحب کے گھر میں چوری ہو گئی۔ صبح کو رام لال اُٹھا تو اس کو معلوم ہوا، جانے ہی کی فکر میں تھا کہ زمیندار کا پیادہ آیا اور بولا۔

"ڈپٹی صاحب بلا رہے ہیں"

رام لال اسکے ساتھ چلا گیا، ڈر رہا تھا، اور غریب ڈرتا کیسے نہیں، جب پہرہ دیتا تھا تو بات سننی پڑتی تھی، اور اب ڈپٹی صاحب کو یہ تھوڑے یاد رہیگا کہ انہیں نے پہرہ دینے کو منع کر دیا تھا۔ اسی خیال میں الجھا ہوا رام لال بنگلہ پر پہنچا، ڈپٹی صاحب کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے اور اُن کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں، دیکھتے ہی غریب پر جھپٹ پڑے اور جتنی گالیاں دے سکتے تھے دیں، دو چار تھپڑ بھی جو بوڑھے رام لال کی قسمت میں لکھے تھے مل گئے۔

تھانیدار آیا، چوری کی رپورٹ لکھائی گئی اور وہ چلا گیا۔ ڈپٹی صاحب رام لال کی جتنی شکائتیں کر سکتے تھے ختم کر دیں، نتیجہ اور تو کچھ نہ نکلا، البتہ رام لال کی نوکری جاتی رہی اور اسکے بلند پوری رونی کی بات ہو گئی

یہ کہانی بہت پرانی ہے، اب نہ رام لال ہے۔ اور نہ ڈپٹی صاحب، مگر اس کہانی کو لوگ اب بھی دہرایا کرتے ہیں۔

ٹوٹا تارہ

آج اس لمبے چوڑے شہر میں وہ خود بالکل اکیلا محسوس کر رہا تھا۔ وہ پارک کے ایک بنچ پر بیٹھا تھا۔ سامنے بڑے سے تالاب میں عالیشان عمارتوں کی بجلی کی روشنی کھیل رہی تھی۔ پارک میں شوقین مزاج لوگ تالاب کے کنارے ٹہل رہے تھے۔ کہیں کہیں کچھ لوگ ایک جگہ بیٹھ کر باتیں کر رہے تھے۔ آپس کی چھیڑ چھاڑ، دلچسپ باتیں، ہنسی، مذاق، قہقہے اور آس پاس کی سڑکوں پر آنے جانے والی گاڑیوں کی کھڑ کھڑاہٹ۔

پرکاش پارک کے ایک بنچ پر پیچھے کی طرف جھکا ہوا بیٹھا تھا، سر کے بال اُلجھے تھے۔ اُس کی آنکھیں تالاب کی سطح پر تھیں لیکن اُس کا دماغ پچھلے واقعات کی یاد سے بھرا ہوا تھا۔ جیسے شام کے وقت کبوتروں کا ڈربہ۔ یا کسی میلے کے موقعہ پر تھرڈ کلاس کا ڈبہ ——— ایک ایک بات اُس کو

اس طرح یاد آ رہی تھی، جیسے یکے بعد دیگرے سینما کی تصویریں۔ اُس کا دماغ پریشان تھا ـــــــــ

اُس کو ایک بات یاد آئی جب اُس نے اپنے دوست رمیش سے رادھا کا ذکر کیا تھا۔ رمیش نے کہا تھا "ان باتوں کو دل میں جگہ نہ دو۔ ابھی پڑھائی ختم کرلو" تو اس نے جل کر کہا "تم دیوانے ہو۔ میں ایک زمانے سے چپ چاپ دل ہی دل میں اُس کی پوجا کر رہا ہوں۔ اور اب جب رادھا کی ماں کو اپنی ماں سے بیاہ کرنے کی باتیں کرتے تو سنا تو اُس کا ذکر نہ کروں۔ اور وہ بھی تم سے۔"

"رمیش نے کہا تھا۔

"دو سال اور باقی رہ گئے ہیں بی۔ اے کرلو، پھر ساری رنگینیاں سمیٹ کر اپنے دل میں رکھ لینا۔"

اور اس نے شاعرانہ انداز میں کہا تھا۔

"رادھا بھی مجھ سے پریم کرتی ہے اور جب دو ندیاں ایک ہی طرف بہنے لگیں تو جلد سے جلد ان کی دھاراؤں کو ملکر ایک ہو جانا چاہئے پھر ان میں زیادہ روانی اور تیز بہاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔"

رمیش نے سوکھے پن کے ساتھ جواب دیا تھا۔

"دیکھتا ہوں تمہاری طبیعت میں رومان زیادہ پیدا ہوتا جا رہا ہے ـــــــــ"

اس پر اُس نے کہا تھا۔

"بیشک جس نوجوان کے پہلو میں رومان پرور دل نہیں ہوتا۔ جس کے دل میں اُمنگیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور نہ ترنگیں اُٹھتی ہیں۔ حوصلے ہوتے ہیں اور نہ ولولے جس کسی کے دل میں ہر وقت ایک ہنگامہ نہ پیدا ہوتا ہے۔ اُسے نوجوان کہنا غلط۔ ایسے لوگ فرائض کا بوجھ کندھے پر اُٹھائے پھرتے ہیں۔ دوسروں کی بنائی ہوئی زندگی کی لمبی سڑک پر آنکھیں بند کئے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ ایسے

لوگ دنیا کو کوئی نیا راستہ نہیں دکھاتے۔ وہ نہ کوئی شاندار کامیابی حاصل کرتے ہیں اور نہ ہو لیتا ک
ناکامی۔ ایسے لوگوں کی زندگی بار ٹباری کے بیل سے زیادہ دلچسپ ہرگز نہیں۔ تم مجھے ایسا ہی
بیل دیکھنا چاہتے ہو۔"

اس پر رمیش نے بڑی سنجیدگی سے کہا تھا۔

"اس لمبی تقریر کا مطلب؟"

اُس نے جواب دیا تھا۔

"مطلب یہ کہ رادھا کو حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش۔"

رمیش نے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

"کوشش کی بات کیا ہے۔ یہ تو جانی ہوئی بات ہے کہ وہ تم سے بیاہی جائیگی۔ پھر دن رات
اُس کے خیال میں ڈوبے رہنا کیا معنی اُس سے زیادہ اہم مسئلہ تعلیم کا ہے۔ اس سے غفلت نہ کرو۔"

رمیش کی اس بات پر وہ خفا ہو کر اُسکے گھر سے چلا آیا تھا۔ اور خفگی اتنی تھی کہ رمیش سے
ملنا جلنا اُس نے ترک کر دیا تھا ——— آج نہ جانے رمیش کہاں تھا۔

پرکاش اُٹھ بیٹھا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے سے پردہ سا ہٹ گیا۔ رمیش نے موقع
موقع پر جو باتیں کہی تھی وہ سب ایک ایک کر کے سامنے تھیں اُس کا دل چاہا کہ خوب روئے
مگر رو نہ سکا۔ دوسرے واقعات یاد آنے لگے اور وہ چپ چاپ سوچنے لگا۔ اب کیا ہو۔

"اب کیا ہو؟"

یکایک اُسے رادھا کا جملہ یاد آگیا جب اُس نے پہلی مرتبہ کھلکر محبت کا اقرار کیا تھا۔ اور

یہی سوال کیا تھا۔ اور اس نے پورے جوش کے ساتھ کہا تھا۔

"جس طرح بچپن سے ساتھ ہیں، ساری زندگی ساتھ رہیں گے۔"

اس کو بچپن سے لیکر جوانی تک کی باتیں ایک ایک کر کے یاد آنے لگیں۔ دونوں کے ماں باپ کی دوستی۔ پاس پاس گھر۔ باغیچے میں ساتھ کھیلنا۔ امرود کے درختوں پر چڑھنا اور رادھا کو پھل توڑ کر دینا، کبھی آدھا پھل کاٹ کر دینا۔ پھر پڑھنا۔ پڑھنے میں کمی، پھر رادھا کو پڑھانا۔ کھیل کود شرارتیں، پھر ایثار رادھا سے کرنا۔ اس کا لجانا۔ دونوں کا الگ الگ رہنے کی کوشش کرنا۔ پھر بھی کسی وقت نہ بھولنا۔ پھر پڑھانا۔ بہت سی باتیں۔ بہت سی باتیں۔ محبت کا اقرار۔ اسکے بعد دونوں کے ماں باپ کی بات چیت —— دونوں کی خوشی۔ والدین کے سامنے ملنا چپ چاپ، سادہ لوحی کے ساتھ۔ مگر وقت نکال کر دل کی باتیں کہہ جانا۔

پھر ایک دن کی بات اس کو یاد آئی۔

وہ اپنے کمرے میں اکیلا بیٹھا تھا۔ اسکے ہاتھ میں ایک کتاب تھی لیکن اسکا دماغ اور دل دونوں ایک فلم کی کہانی میں اُلجھے ہوئے تھے۔ جو اس نے پچھلی رات کو دیکھا۔ کہانی میں یہ ثابت کیا گیا تھا کہ مرد کم ظرف اور بے وفا ہوتا ہے۔ عورت مجسم ایثار اور شرافت کا نمونہ —— وہ سوچ رہا تھا کہ کہانی کے مصنف کا خیال کس حد تک صحیح ہے۔؟

اتنے میں رادھا آگئی۔ بالکل اچانک طور پر —— اور آتے ہی سوال کر بیٹھی تھی۔

"آپ کا سریندر کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

سریندر اس فلم کا ہیرو تھا جس نے ایک عرصہ تک ایک غریب لڑکی سے محبت جتائی۔

لیکن زندگی میں کامیاب ہونے کے بعد اس نے ایک مالدار لڑکی سے شادی کر لی۔ اور غریب کی محبت کو ٹھکرا دیا۔

اور اس نے گھبرا کر ہکلاتے ہوئے کہا۔

"اس کا مطلب ؟"

رادھا نے کہا تھا

مطلب بالکل صاف ہے۔ ماتاجی کی باتیں آپ سن چکے ہونگے۔ ان دونوں نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ ایک سال میں آپ بی۔ اے پاس کر لینگے۔ اُس وقت بڑے بڑے گھروں سے آپ کی بات آئے گی۔ پھر۔۔۔۔"

اس نے پورے جوش کے ساتھ جواب دیا تھا۔

"سریندر تو کمینہ تھا۔ ذلیل مردود ——"

اس پر رادھا مسکرا کر کمرے سے چلی گئی تھی۔ اور وہ دیر تک اُس کی مسکراہٹ سے لطف لیتا رہا۔ اُس کے دل پر جیسے کسی نے تان کر گھونسہ مار دیا ہو۔

پرکاش پھر اُٹھ بیٹھا اُس نے پارک کے چاروں طرف نظر دوڑائی ہر طرف مرد، عورتیں اور بچے ٹہل رہے تھے۔ پارک میں چہل پہل شام ہی جیسی تھی۔ گو کچھ رات جا چکی تھی۔

اُس نے دیکھا۔ ایک عمر رسیدہ عورت کے ساتھ ایک نوجوان پارک سے باہر جا رہا تھا عورت کچھ کہتی جا رہی تھی اور نوجوان سر جھکائے اُس کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔ وہ کیا بول رہی تھی۔ اُسے پرکاش نہ سن سکا۔ وہ دونوں چلے گئے لیکن پرکاش پارک کے دروازے کیطرف دیر تک دیکھتا ہی رہا۔

اُسے اپنی ماں یاد آگئی۔ اُس کی محبت بھری باتیں اور اپنی شرارتیں اسکا دل مچل کر رہ گیا وہ پاک اور بے غرض محبت کی دیوی سیکڑوں میل اُس سے دور تھی۔ اگر اس وقت وہ اس کے پاس ہوتی تو وہ اُس کی گودی میں منہ ڈال کر دیر تک روتا رہتا۔

اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ پھر گالوں پر ڈھلک آئے۔ ساتھ ہی ایک بات یاد آگئی۔

وہ امتحان کی تیاری کر رہا تھا ——— ماں نے کہا تھا۔

"جلدی جلدی پڑھ۔ تیرا بیاہ کروں ——— بہو لاؤں۔ کب تک اکیلی رہوں گی"

اس پر شرارت سے اُس نے جواب دیا تھا۔

"ماتا جی میں بیاہ نہیں کروں گا"

ماں نے پوچھا تھا

"کیوں ؟"

اُس نے شرارت سے لیکن بڑے فلسفیانہ انداز میں دیا تھا۔

"ماتا جی! بیاہ کرنے سے آدمی کسی کام بھی نہیں رہتا۔ عورت کا ساتھ ہوتے ہی مرد روپیہ کمانے کی مشین بن کر رہ جاتا ہے۔ اسکی ساری خوشیاں عورت کی خواہشوں کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں"

ماں نے بات کاٹ کر کہا۔

"تو پھر دنیا کیسے چلے۔ گھر گرہستی کی خوشی کیسے نصیب ہو۔ اور استری کا پریم جو مرد کیلئے دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ وہ کیسے حاصل ہو۔ ماں باپ اور بنس کا نام کیسے چلے۔ ؟"

اس نے جواب دیا تھا۔

"ماتا جی اور سب باتیں تو ٹھیک۔ پر استری پریم کا نام نہ لیجئے ہیں تو سمجھتا ہوں کہ کوئی عورت کسی سے محبت نہیں کر سکتی۔ عورت کو صرف اپنے سنگار کی فکر ہوتی ہے۔ وہ اپنے پتی سے تھوڑا بہت دکھاوے کا جو پریم کرتی ہے۔ وہ اس لئے کہ استری بننے کے بعد یہ استری کا سنگار ہے۔ وہ بچے کی آرزومند اسی لئے ہوتی ہے کہ ایک خاص عمر تک بچہ ہونا اُس کے سنگار میں داخل ہے۔ تو پھر میں کسی کا سنگار بننے کے لئے اپنی ساری آزادی اور خوشی کا ناس کیوں کروں؟"

اس کی ماں نے کہا تھا۔

"تو رادھا کو بھی ایسی ہی سمجھتا ہے؟"

اس نے جلدی میں گھبرا کر کہہ دیا تھا۔

"ہاں ——"

حالانکہ اس کا دل اسکے زبان کے خلاف تھا۔ اُس کی ماں نے اُس پر اُس کو پیار سے ایک تھپیڑ مارا تھا۔ اور اُس نے اپنا سر ماں کی گود میں ڈالکر زور زور سے قہقہہ لگانا شروع کر دیا تھا اس کے دل پر جیسے کسی نے تان کر گھونسہ مار دیا۔ اُف یہ دُنیا کس قدر نرالی ہے۔ اُس کا دل بیٹھنے لگا —— دُنیا اُس کو بالکل سناٹی محسوس ہونے لگی۔ جیسے جیل کی کوٹھڑی میں محسوس ہوتی تھی۔ اُس کو جیل کی کوٹھریاں یاد آئیں۔ جن میں تین سال تک وہ رہا تھا۔ ایک جیل سے دوسرے جیل میں اور دوسرے سے تیسرے میں۔

اس کا سر بنچ کی پچھلی طرف جھک گیا۔ نظریں آسمان میں جم گئیں۔ منہ آدھا کھل گیا اور وہ سوچنے لگا تین سال کی مدت کتنی جلدی ختم ہو گئی۔ اور اس مدت میں کیا کیا انقلاب ہو گیا

جیل کی کوٹھری کی یاد کے ساتھ وہ سارے واقعات اس کو یاد آ گئے جن کی وجہ سے وہ جیل گیا تھا۔ امتحان کے بعد کلکتہ کی سیر۔ وہاں چند نوجوانوں سے ملاقات۔ مزدوروں کی تحریک میں شرکت۔ نئے حوصلوں کے ساتھ واپسی۔ مل کی ہڑتال۔ اس کو کامیاب بنانے کی پوری جدوجہد۔ ہنگامہ۔ گرفتاری، مقدمہ۔ فیصلہ سننے کے لئے اپنے کل لوگوں کا آنا۔ تین سال کی لمبی سزا۔ سزا سن کر رادھا کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو ......

پھر جیل کی کوٹھری۔ رادھا کے محبت بھرے خطوط ــــــ اب یہ سب ہولناک اور دلفریب خوابوں کے مجموعہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ جن کی تعبیر بڑی ہولناک تھی۔

رادھا کے خطوط ایک ایک کرکے یاد آنے لگے۔ ہر خط میں محبت کا کھلا اقرار، بے تابیاں، بیقراریاں۔ دیدار کی تمنا۔ ملاقات کا شوق۔ رادھا کی منگنی کی خبر۔ پھر اس کے بیاہ کے تذکرہ کی خبر ــــــ پھر اس کا وہ خط جس میں اس نے لکھا تھا "جان دیدوں گی لیکن تمہارے سوا دوسرے کی نہیں ہو سکتی" پھر وہ خط جس میں اس نے لکھا تھا ــــــ "وہ نالائق ڈپٹی ہے اور آج کل بد لکر یہیں آ گیا ہے۔ ہر روز آتا ہے۔ بابوجی کے پاس دو دو گھنٹے وقت گنواتا ہے۔ اس کو کیا معلوم۔ بابوجی کا حکم رادھا مان سکتی ہے۔ رادھا کا دل نہیں مان سکتا۔" پھر رادھا کی خاموشی ــــــ ماں باپ کا ملاقات کو آنا۔ ایک منحوس خبر رادھا کی شادی کی۔

اس کا دل جلدی جلدی کروٹیں لینے لگا۔ جیسے کوئی زبردست آدمی اس سے اسکی عزیز ترین چیز چھینے لئے جا رہا ہے۔ اسکی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔

جیل کی تاریک کوٹھری میں اس کا رات رات بھر جاگنا اور پریشان رہنا ہر خط کھولتے

وقت ڈرتے رہنا کہ کہیں رادھا کی خودکشی کی خبر نہ ہو۔ بے چارگی اور بے بسی کی حالت میں تڑپ تڑپ کر وقت کاٹنا۔

وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا کہ پارک سے نکل کر باہر جائے۔ مگر اُس کے دل پر پھر ایک دھکا لگا اور تین دن کی کیفیتوں نے اُسے تڑپا دیا۔ ساری باتیں تیزی کے ساتھ دماغ میں آگئیں جیل سے رہا ہو کر گھر آنا۔ ماں باپ سے ملنا سب کی خوشی، دوسرے ہی دن رادھا سے ملنے کو یہاں چلے آنا۔ بڑی مشکلوں سے رادھا کے گھر کا پتہ معلوم کرنا۔ اس سے ملنا۔ رادھا کا لطف اُس کی خوشی۔ اس کے شوہر سے تعارف۔ اُس کا اظہار مسرت۔

یہ باتیں یاد کر کے اُسے وحشت ہونے لگی۔ اس کا دل چاہا کہ سامنے تالاب میں کود پڑے جب اُس کو رادھا کی انتہائی بے وفائی یاد آئی۔

آج وہ ایسے وقت میں گیا جب اُس کا شوہر کچہری گیا ہوا تھا۔ دو گھنٹے سے زیادہ وہ رادھا کے پاس ٹھہرا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ رادھا اپنی مجبوریوں کی داستان چھیڑے گی۔ روئے گی۔ دل کی بھڑاس نکالے گی۔ مگر اس کی امید کے خلاف جب تک وہ رادھا کے پاس رہا۔ رادھا برابر اپنے شوہر کی تعریف کرتی رہی۔ وہ برابر اپنی اور شوہر کی پر لطف زندگی کے گیت گاتی رہی اُس نے نہ تو اس کا حال پوچھا۔ اور نہ پرانی باتوں میں سے کسی ایک کو دہرایا۔

پرکاش گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ اُس کا دل زور سے دھڑک رہا تھا۔ اور سر میں ہلکا ہلکا سا چکر آرہا تھا۔ اُس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ پارک بالکل سناٹا تھا۔ جیسے ہڑتال کے دنوں میں ملوں میں سناٹا ہوتا ہے۔

آج وہ اس لمبے چوڑے شہر میں خود کو بالکل اکیلا محسوس کر رہا تھا۔ تمام ارمانوں اور حوصلوں کے خوشنما محل جو اس نے کبھی بنائے تھے۔ بس لمحے زمانہ کی ٹھوکر سے پاش پاش پڑے تھے۔ اور وہ سوچ رہا تھا۔ آئندہ زندگی کیوں نہ کسی مفید کام میں صرف کر دی جائے ——
مگر وہ اس لمبے چوڑے شہر میں خود کو بالکل اکیلا محسوس کر رہا تھا۔ جیسے غیر محدود فضا میں ٹوٹا تارہ ۔

شرابی

جب اُس کی آنکھ کھلی۔ تو سورج اونچا اُٹھ چکا تھا اور اُس کی تیز کرنیں اُسکے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ اُس نے اُٹھتے ہی چاروں طرف نظر پھرا کر دیکھا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ اُس نے سر میں ہلکا ہلکا درد محسوس کیا۔ ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہی اُس کا ہاتھ پسینے سے بھیگ گیا تھکن سے اُس کا سارا بدن چور اور ٹوٹتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ ماتھے کو دو چار بار دبانے کے بعد اُس نے ایک لمبی جمائی لی اور کوشش کر کے سارے جسم کو زور دیکر کھینچا اُٹھنے کی کوشش کی لیکن جی نہ چاہا وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔

شراب کی ٹوٹی ہوئی بوتل اور گلاس کے ٹکڑے اسکے سامنے بکھرے پڑے تھے۔ اُن پر اُس کی نظر جم گئی۔ وہ بالکل خالی دماغ تھا۔ کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آ رہی تھی —— رات کے واقعہ پر وہ غور کرنے لگا۔ رات کتنی پیاری تھی۔ چاندنی رات تھی۔ کبھی کبھی بادل کے ٹکڑے چاند

کو چھپا لیتے تھے۔ ہیروائی تیزی کے ساتھ چل رہی تھی۔ وہ اپنے چمن میں بیٹھا تھا۔ چمن کی یاد آتے ہی اُس کو کچھ تکلیف سی ہوئی۔ اور تھوڑی دیر کے لئے اُس کے خیالات غائب ہو گئے

—— مگر پھر اُس کو خیال آیا —— ایسے وقت میں طبیعت چاہی کچھ پینا چاہیے۔

یہ خیال آتے ہی وہ سوچنے لگا۔ اسی پینے نے کہیں کا نہیں رکھا۔ چار دکان زمیندار اور کل نقدی —— اب کچھ نہیں —— اس کو اپنے کئے پر افسوس آنے لگا ...... وہ بری طرح پچھتانے لگا۔ آخر اُس نے شراب پی کیوں تھی۔ اس کمبخت کو منہ ہی کیوں لگایا تھا —— بُرا ہو ان دوستوں کا جنھوں نے اس کی چاٹ دلائی۔ اب کوئی کمبخت آتا بھی نہیں ——۔

میں اب بھی وہی ہوں۔ میرا مکان وہی ہے۔ میرا چمن وہی ہے۔ ہاں پہلے جیسا ہرا بھرا نہیں۔

اُس کے دل پر ایک دھکا لگا —— آہ کتنا خوبصورت چمن تھا لوگ دیکھ کر تعریفیں کرتے تھے وہ اسی چمن میں بیٹھا تھا۔ دوست احباب بیٹھے تھے اور پینے کی بات چھڑی —— اور یہ لعنت سر پر بھوت بنکر سوار ہو گئی۔

اُس نے یکایک محسوس کیا۔ اُس کے پسلی میں کچھ درد سا ہو رہا ہے قمیص اٹھا کر ٹٹول کر دیکھا پسلی پر نیلا نشان اور ابھار تھا اور درد بھی۔ یاد آ گیا کہ اُس کو لوگوں نے مارا بھی ہے، تھوڑی دیر تک وہ اپنے کئے پر پچھتا رہا سوچنے لگا۔ اگر شراب نہ پیتا تو یہ نوبت ہی نہ آتی۔ آج اس حال میں نہ ہوتا۔

مگر اس کا خیال بہک کر ایک ہوٹل میں پہنچا جہاں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ جا کر شراب پیا کرتا تھا۔ صاف صاف کپڑے پہنے بیرے چمکتی ہوئی بوتلیں۔ چھلکتے ہوئے گلاس

بیروں لکا اوپ۔ سگریٹ کی سنہری ڈبیہ ـــــ ساری چیزیں یاد آئیں۔ تھوڑی دیر کیلئے خود کو اسی ماحول میں محسوس کرنے لگا۔ اپنی موجودہ حالت کو بھول گیا ـــــ پھر باتیں یاد آئیں ـــــ اپنے عالیشان بنگلے میں دوستوں کی دعوتیں ـــــ پیلی پیلی چمکتی ہوئی بوتلیں۔ دوستوں کے قہقہے دلچسپیاں ـــــ پھر چمپا سے ملاقات اور ساری دلچسپیاں۔

چمپا کی یاد نے اُس کو تھوڑی دیر کے لئے بے چین کر دیا لیکن اُس کی بے رخی اس کو یاد آگئی۔ وہ روٹھ کر چلی گئی تھی۔ اس کی فرمائش تھی۔ ایک ہار کی وہ پورا نہ کر سکا تھا۔ حالانکہ ہزاروں روپے لے چکی تھی۔ مگر اس نے آنکھ بدل دی۔ ایک ہی بار میں۔

چمپا کی بے رخی کے ساتھ ہی اُس کو اپنی بیوی کی یاد آگئی جس کو اس نے خوب خوب ستایا اور رلایا تھا۔ مگر پھر بھی جب پیسے ختم ہو گئے۔ تو اس نے اپنا سارا گہنا بھی اس کے حوالہ کر دیا۔ اُس کو اپنی زیادتیاں یاد آئیں اور دل دُکھنے لگا۔ اگر اب وہ موجود ہوتی تو گڑگڑا کر اس سے معافی مانگ لیتا۔ لیکن وہ مر چکی تھی۔ یہ خیال آتے ہی اُس کو اور بھی افسوس ہوا۔ آہ میں نے اُس کے نام پر ایک دھیلا خیرات بھی نہیں کیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

بیوی کی موت کے خیال نے اُس کو اپنی موت کی یاد دلا دی۔ وہ سوچنے لگا۔ مجھے بھی ایک دن مرنا ہے۔ آہ کتنے گناہ میں نے کئے ہیں۔ نہ دین کا رہا اور نہ دنیا کا۔ دونوں گنوا بیٹھا خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ مرنا تو ایک دن ہوگا ہی۔ آہ کبھی ایک وقت نماز بھی تو نہیں پڑھی اور یہ سب کچھ شراب کی وجہ سے ہوا ـــــ

شراب کی یاد آتے ہی پھر دوسری باتیں یاد آنے لگیں، برانڈی وِسکی، شامپین۔ پھر رم، پورٹ، ——— پھر پیسوں کی کمی نے ولیسی شراب پلائی ——— بھٹی کی بدبو، گندے لوگوں کی فضول بکواس۔ ذلیل قسم کے گانے ——— وہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔

اس کو اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی، وہ اپنے کاموں پر کڑھنے لگا۔ اس کا دل دکھنے لگا۔ آنکھ میں آنسو بھر آئے۔ "اس کمبخت شراب نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا"۔ اُس نے دِل ہی میں کہا۔ اور رونے لگا۔ دیر تک روتا رہا۔ سارا چہرہ آنسو اور پسینے سے تر ہو گیا۔ رات کو کچھ دوستوں کے ساتھ بھٹی سے آیا تھا۔ اُن لوگوں نے جن کے روپئیں روپئیں پر میرے احسانات ہیں آہ یہ سب کچھ میری ناسمجھی سے ہوا، لیکن اب مجھے سنبھل جانا چاہیئے۔

اُس نے یہ فیصلہ کیا۔ اب کبھی شراب نہ پیئے گا۔ نماز پڑھے گا۔ شریف آدمیوں کی سی زندگی گزارے گا۔ وہ سجدے میں گر پڑا اور خوب رویا۔

دھوپ تیز ہو گئی۔ گرم ہوا چلنے لگی تو وہ اُٹھا۔ اور سر جھکائے گھر کی طرف چلا۔ سنسان میدان تھا۔ ایک آدمی نظر نہ آیا۔ کہیں کہیں پر درخت تھے اور بس۔

وہ برابر چلتا رہا۔ نیک بننے کا وہ مضبوط فیصلہ کر چکا تھا۔ زبان پر برابر توبہ استغفار توبہ استغفار کا دورہ تھا۔

آخر وہ شہر میں پہنچا۔ ساری رونقیں تھیں۔ کہیں کچھ کمی نہ تھی ——— ایک دکان پر گراموفون بج رہا تھا۔ لوگوں کی بھیڑ تھی۔ ریکارڈ بھی اچھا تھا۔ اس بھیڑ میں وہ بھی جا ملا۔ سب کے ساتھ سنتا رہا۔ گراموفون بجنا بند ہوا تو وہ گھر کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ میں گاڑی گھوڑے، موٹر، سائیکل

اور ساری سواریاں ملیں، ہٹو بچو کے ہنگامے نے ساری باتیں اُس کے دماغ سے نکال دیں صرف بچنے کا خیال اُس کے دماغ میں رہ گیا۔

وہ کچھ دور اور بڑھا۔ دور سے دیسی شراب کی بو ناک میں آئی لیکن وہ سر جھکائے بڑھتا گیا۔ دل چاہا کہ اس طرف چلے لیکن وہ چند قدم اور آگے بڑھا ـــــ پھر راستہ بدل کر بھٹی کی طرف چلا۔ خیال ہوا۔ پیسے گے نہیں، مگر شاید کوئی کمبخت نظر آجائے۔ وہ اسی طرف بڑھتا گیا۔ اور بھٹی کے سامنے پہنچا۔ بہت سے آدمی بیٹھے تھے۔ سب کو دیکھنے لگا ـــــ دیر تک دیکھتا رہا۔ گرمی معلوم ہوئی۔ خیال ہوا اگر کہیں چھاؤں میں تھوڑی دیر بیٹھنا چاہیے ـــــ خیال ہوا بھٹی میں۔ لیکن پھر خیال بدل گیا۔ وہاں جانا ہی بُرا ہے۔

دیر تک سوچتا رہا۔ شراب کی بو برابر آ رہی تھی۔ دل چاہتا۔ لیکن وہ توبہ کر چکا تھا۔ دل کڑا کئے کھڑا رہا۔ لیکن پاؤں جم کر رہ گئے۔ آگے نہ بڑھے ـــــ آخر اس نے سوچا ـــــ توبہ تو کر ہی لی ہے۔ اور اس کمبخت کو ہمیشہ کے لئے چھوڑنا ہی ہے ـــــ بس آج بھر ـــــ کل سے بالکل نہیں

یہ خیال آتے ہی وہ بھٹی میں گھسا۔ کچھ پیسے جیب میں تھے۔ شراب خریدی۔ گلھڑ میں انڈیل کر ایک گلھڑ اُس نے پیا۔ شراب حلق سے نیچے اُتری اور وہ ساری باتوں کو بھول گیا۔

وہ رات

ہر آدمی کی زندگی میں ایک ایسا وقت ضرور آتا ہے جب اسکی خواہش خودکشی کر لینے کی ہوتی ہے۔

وہ رات!! وہ رات بھی عجیب رات تھی جب زندگی سے میں اُکتا گیا تھا ——— وہ رات اب بھی یاد آتی ہے۔

چھ سال کے بعد زائن سے یکایک راستے میں ملاقات ہو گئی۔ وہ میرا بچپن کا دوست تھا۔ بلکہ کتنی خوشی ہوئی ہو گی ——— اسے میرے سوا دوسرا کون جان سکتا ہے؟ .... ہم دونوں بڑی محبت سے ملے۔ وہ گھر سے سیر کیلئے آیا تھا اور میں پردیس میں پیٹ پالنے کیلئے محنت کرتا تھا۔ بہت دنوں پر ملے تو ہم لوگ سب کچھ بھول گئے اُس نے مجھ سے اور میں نے اُس سے بہت سی باتیں پوچھ ڈالیں جائے ختم کر لینے کے بعد بھی ہم دونوں بہت دیر تک ہوٹل میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ جب

باہر نکلے تو دیر تک ساتھ ٹہلتے رہے۔ نرائن دوسری جگہ ٹھہرا ہوا تھا۔ اُس نے کہا۔

اچھا بار ریاض اب مجھے جانا چاہیے میرا انتظار ہو رہا ہوگا مگر چلو تمہارا گھر دیکھتا چلوں کل پھر آگرمل لوں گا گھر کا نام سنتے ہی میں گھبرا گیا ——— میرا گھر! میرے گھر کو دیکھ کر نرائن کیا کہے گا۔ میرے گھر کو دیکھ کر! وہ مجھے عالیشان کوٹھی میں رہتے دیکھ چکا تھا۔ اگر عالیشان کوٹھی میں نہ رہتا ہوتا تو پھر دوستی ہی نرائن سے کب ہوتی مگر اب ——— زمانہ کبھی ایک سا نہیں رہتا۔

میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ نرائن کو اپنے گھر لے جاؤں مگر کوئی چارہ نہ تھا پھر یہ سوچ کر تسکین ہوئی کہ کلکتہ میں جس طرح میں رہتا ہوں، وہ کوئی معیوب طریقہ نہیں۔ زیادہ تر لوگ اسی طرح رہتے ہیں میں نے کہا۔

"چلو"

ہم دونوں چلے۔ رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ گھر کی طرف چلتے ہی بہت سے خیالات میرے دماغ میں چکر کاٹنے لگے۔ شہر میں ہر آدمی محل میں نہیں رہتا۔ بڑے بڑے آدمیوں کو معمولی طور سے گزارا کرنا پڑتا۔ میں تو اکیلا ہوں۔ دولتمند لوگوں کو یہاں تین چار کمروں میں پورے خاندان کے ساتھ زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ ایسا نہیں کہ نرائن اسے نہ جانتا ہو۔ دوسرے نرائن کو کبھی اس بات کا پتہ نہیں چل سکتا جس سے اسے معلوم ہو کہ میری حالت اب پہلے جیسی اچھی نہیں۔ کرایہ کا ہی سہی لیکن چار منزلہ عمارت کی تیسری منزل پر میرا کمرہ ہے۔ مکان گندہ ہے۔ مگر صرف نچلی منزل ہی جہاں مزدور لوگ رہتے ہیں۔ اوپر کا حصّہ بالکل صاف ستھرا ہے ——— اور میرا کمرہ! وہ بھی بُرا نہیں۔ ہوا دار ہے۔ کافی بڑا ہے کرایہ کی مسہری میز اور کرسیاں بھی ہیں۔ اگرچہ دو مہینے سے کسی چیز کا کرایہ ادا نہیں ہوا

تو نرائن کو کیا معلوم ۔

پھر بھی میں چپ نہ رہ سکا ۔ اور مجھے یہ کہنا پڑا ۔

" نرائن ! یہاں میرے پاس ویسی شاندار کوٹھی نہیں ہے ۔ تم دیکھو گے تو حیرت میں آجاؤ گے کہ میں کتنا بے سروسامان ہوں ۔ تم جانتے ہو میں یہاں کاروباری آدمی کی زندگی گزارتا ہوں ۔ بالکل ایک بنیا کی طرح ۔ پرانی ٹھاٹ ختم ۔ "

نرائن نے کہا ۔

" باوا کا پیسہ نہیں ہے اب " اب تو اپنی کمائی ہے نا ...... "

میں مطمئن ہو گیا نرائن کو میری طرف سے ابتک خوش فہمی ہے ۔ میری جیب میں پانچ روپے اور کئی آنے پیسے تھے ۔ مجھے اطمینان تھا کہ اُن سے نارائن کی خاطر کی جا سکتی ہے ۔ چائے کیک اور پان سگریٹ آسکتا ہے ۔ زیادہ کی ضرورت نہیں ۔ نرائن یہ تو جانتا ہی ہے کہ میں کوئی لکھ پتی نہیں ۔

ہم دونوں تیزی کے ساتھ چل رہے تھے ۔ راستہ میں اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں ۔ آخر ہم لوگ اُس چار منزلہ عمارت کے قریب آ گئے ۔ جہاں مجھ جیسے بہت سے آدمی کبوتروں کی طرح رہتے ہیں ۔ دن بھر کڑی محنت کر کے روٹی کماتے ہیں ۔ اور رات کو تھوڑی دیر چڑیوں کی طرح شور مچا کے سو رہتے ہیں ۔ میں نے نرائن کو مکان دکھایا ۔ باہر سے بڑا شاندار اور پُر رونق تھا ۔ باہری حصے میں ایک حلوائی کی دکان تھی ۔ ایک بنگالی کا ہوٹل تھا اور ایک پان والے کی دوکان ۔ میری ضرورت کی ساری چیزیں فوراً ہی مل سکتی تھیں ——— میں نرائن کو ساتھ لیتا ہوا اندر آیا ۔ نچلی منزل میں کچھ مزدور انگیٹھیوں پر اپنا کھانا پکا رہے تھے ۔ کوئی گیت گا رہا تھا ۔ اور کوئی دوسرے سے اپنے گھر کی باتیں دہرا

رہا تھا۔ میں تیزی کے ساتھ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ نرائن میرے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ کوئی ریمارک نہ کرے میرا خیال صحیح نکلا۔ آخر اُس نے کہہ ہی دیا۔

"ریاض! تم اس مکان میں کس طرح رہتے ہو۔ اور اب تک زندہ کیسے ہو؟"

مجھے نرائن سے اسی کی امید تھی۔ وہ دولتمند آدمی تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میری زندگی اُسے نہیں بھائے گی۔ میں نے بات بناتے ہوئے کہا۔

"نرائن یہ بڑی اچھی جگہ ہے۔ مجھے تو ایسا آرام اور کہیں نہیں مل سکتا۔"

وہ بولا۔ "اور یہ ہنگامہ"

"کیا کیا جائے۔ مگر خلوص اور محبت انہیں غریبوں میں ہے۔"

نرائن کو لیکر میں اپنے کمرے کے سامنے پہنچا۔ میرے کمرے کے دروازہ میں دو تالے بند تھے۔ ایک تو میں نے خود ہی بند کر رکھا تھا۔ دوسرا کس نے بند کر دیا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا میں گھبرا گیا۔ آخر یہ کہکر بات ختم کر دی کہ ایک میرے دوست بھی ٹھہرے ہیں۔ شاید انہوں نے ہی دوسرا تالا لگا رکھا ہے حالانکہ اس تالے کی ایک کنجی میں نے انہیں دے رکھی تھی اور دوسرا تالا اُنہیں بند کرنیکی کوئی ضرورت نہ تھی۔

نرائن نے معذرت کی۔ اور جانے کی اجازت چاہی۔ وہ ایک دوسرے دوست کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا میں آہستہ آہستہ نیچے اترا۔ اور نرائن کو رخصت کر کے پھر اپنے کمرے کی طرف چلا۔ جیسے ہی میں مکان میں داخل ہوا اور سیڑھی پر پاؤں رکھنا چاہا مکان کے بوڑھے دربان نے کہا۔

صاحب آپکے کمرے میں تالا میں نے بند کیا ہے۔ مالک کا یہی حکم ہے۔ آپ نے تین مہینے سے کرایہ نہیں دیا ہے سیٹھ صاحب بہت رنج تھے۔

میں نے دربان کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا۔ اور کوئی جواب نہ دے سکا۔ اُس نے پھر کہا۔

"میں تالا اسوقت تک نہیں کھول سکتا جبتک آپ کرایہ نہ ادا کردیں' آخر کرایہ کبتک دینگے آپ؟"

میں مشکل سے کہہ سکا۔

"جلد ہی ادا کر دوں گا"

اتنے میں دو تین مزدور آگئے۔ مجھے بڑی ندامت محسوس ہوئی۔ جیسے میں نے چوری کی ہو سارے بدن میں ایک قسم کی گرمی پھیل گئی۔ اور میں بات بڑھنے کے ڈر سے کچھ کہے سنے بغیر وہاں سے باہر چلا آیا۔

سڑک پر وہی بہار تھی۔ کہیں کسی قسم کی کمی نہ تھی۔ ہوٹل کے سامنے کچھ لوگ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ اور گھوڑدوڑ کی باتیں کر رہے تھے۔ روپیوں کی باتیں سن کر مجھے سخت تکلیف ہوئی۔ اور میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

نومبر کا مہینہ تھا۔ اور ہلکی ہلکی سردی پڑنی شروع ہوگئی تھی میں گرم کپڑے بھی پہنے ہوئے نہیں تھا۔ ٹھنڈک محسوس ہونے لگی۔ سوچنے لگا۔ اب کیا کرنا چاہیئے تین مہینے کا کرایہ کس طرح ادا ہو۔ میری جیب میں پانچ روپے اور چند آنے ہیں۔ یہی میری کل پونجی ہے۔ اور تین مہینے کا کرایہ دینا ہے ــــــ یعنی اکیس روپے۔ آخر آئیں گے کہاں سے؟ سوچتا ہوا آگے بڑھا۔ تھوڑی دور جا کر ایک اور چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ مجھے تھکن سی محسوس ہونے لگی میں ہوٹل میں داخل ہوگیا۔ ہوٹل گرم ہو رہا تھا۔ میں نے کھانے کو مانگا۔ لقمہ حلق سے نیچے نہ اترتا تھا۔ پھنستا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ کھانے میں ذرا بھی مزا نہ ملا۔ پھر چائے منگائی۔ اتنے میں ایک قد آور آدمی رکشے سے اتر کر ہوٹل میں آیا۔ اور چائے مانگی۔ ہوٹل والے نے پوچھا۔

"کہاں کا ارادہ ہے سیٹھ"؟

"ارے یار تو روز ہی ٹوکا کرتا ہے۔ ارادہ کہاں کا ہوگا۔ جانتا ہی ہے تو" ــــ ہوٹل والے نے پھر پوچھا۔

"بس چمپا کے گھر اور کہاں"

ہاں تو اور کہاں میرا اور کہاں گھر ہے۔ دن بھر محنت کی۔ رات کو اُس کے گھر آرام کیا۔ میں نے پیسے دیئے اور کچھ سوچے سمجھے بغیر چل پڑا۔ نو بج چکے تھے۔ خیال آیا کہ رات کس طرح کٹے گی۔ کسی دوست سے کچھ روپے قرض لیکر دربان کے حوالہ کروں۔ اور بقیہ روپیوں کا وعدہ کر دوں۔ لیکن خیال آتے ہی یہ بھی یقین آگیا کہ یہ کبھی نہ مانے گا۔ یہ شخص پہلے پولیس میں جمعدار تھا۔ اسکے دل میں رحم کہاں؟ اُس کا جھری والا چہرہ، گھسے ہوئے دانت اور دھنسی دھنسی آنکھیں یاد آگئیں یقین ہوگیا کہ وہ کبھی نہ مانیگا جس طرح بھی ہو۔ لیکن ساتھ ہی ایک خوشی ہوئی۔ اُس نے زائن کے سامنے کچھ نہیں کہا۔ میری عزت رہ گئی۔ اگر اُس کے سامنے کچھ کہدیتا تو بڑی بے عزتی ہوتی لیکن پھر خیال ہوا۔ مگر حیدر کہاں رہیگا۔ وہ غریب میرے ساتھ آکر ٹھہرا ہے۔ اگر دربان زائن کے سامنے کہدیتا تو یہ مصیبت ہی ختم ہو جاتی۔ وہ فوراً جیب سے روپے نکال کر گن دیتا۔ سوچا کہ زائن سے چلکر روپیہ قرض لے جاؤں۔ مگر وہ کہاں ٹھہرا تھا، مجھے معلوم نہ تھا۔

اسی قسم کی باتیں سوچتا ہوا کچھ دور اور بھی نکل گیا۔ مسجد سے نماز پڑھکر لوگ نکل رہے تھے میں کھڑا ہوگیا۔ بعض ملاقاتی بھی تھے۔ باتیں کرنے لگا لیکن دل رندھا ہوا تھا۔ مسجد سے سیٹھ یعقوب نکلے۔ صاحب سلامت ہوئی۔ چمڑے کے بڑے آڑھت دار تھے۔ اپنی عادت کے مطابق بڑے

تپاک سے ملے۔ باتیں کرتے ہوئے اپنے مکان تک لے گئے۔ پھر چائے پلائی۔ پان کھلایا۔ ان کے کچھ اور ملنے والے بھی تھے۔ اُن سے ملایا۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ تپاک سے کہا۔

"آپ سے جب ملاقات ہوتی ہے۔ دل خوش ہو جاتا ہے۔ بہت دنوں پر ملاقات ہوئی ہے دل نہیں چاہتا کہ جانے دوں مگر مجبور ہوں۔ بہت سے دوست آگئے ہیں۔ اور سوچ رہا ہوں کہ کہاں اور کس طرح ان لوگوں کے سونے کا انتظام کروں۔"

میرا دل سن سے ہو گیا میں جب کبھی بھی اُن سے ملنے آیا تھا۔ تو وہ ٹھہر جانے کی ضد کرتے تھے۔ اس رات کو وہاں باتیں کرتے کرتے جب دیر ہو گئی تو میں نے سوچا کہ انہیں کے وہاں سو رہوں گا لیکن سیٹھ یعقوب کے ایک جملے نے مجھے پھر بدحواس کر دیا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ کلکتے میں چار وقت کھانا کھلا دینا آسان ہے مگر ایک وقت ٹھہرنے کی جگہ دینا مشکل ہے ایک دل چاہا کہ سیٹھ صاحب سے سارا حال کہہ دوں۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر رہ گیا۔ دس بج گئے تو اُن سے رخصت ہوا۔

اب پھر میں بازار میں تھا۔ بازار میں وہی رونق تھی۔ صرف میں اداس تھا۔ یا اگر دوسرے ہوں بھی تو میں اُنہیں جانتا تھا نہیں سر جھکائے فٹ پاتھ پر جا رہا تھا سوچ رہا تھا۔ آج کہاں سونے کی جگہ مل سکتی ہے۔ یہ ناگہانی مصیبت کیسے ٹلے لیکن سارے کلکتے میں میرے لئے پناہ کی کوئی جگہ نظر نہ آتی تھی۔ اور میرا دماغ ایسی جگہ ڈھونڈھ نکالنے کی فکر میں ہر ملاقاتی کے گھر کا چکر کاٹ رہا تھا۔ لیکن آخر میں دل کہتا تھا کہ وہاں جانا مناسب نہیں ——"

اسی طرح کی باتیں سوچتا ہوا میں ایک پارک کے قریب پہنچا۔ سارا بدن تھکا ہوا محسوس ہونے لگا۔ بے سمجھے بوجھے پارک میں جا کر ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ وہاں ہلکی ہلکی سردی محسوس ہونے لگی

شبنم برابر گر رہی تھی۔ پاس ایک دوسرے بنچ پر ایک بنگالی نوجوان میٹھا تھا۔ سر کے بال پاگلوں کی طرح بکھرے ہوتے۔ وہ بنچ بجلی کی روشنی سے بالکل ہی قریب تھا۔ اس روشنی میں وہ ایک موٹی سی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اور اس انداز سے جیسے وہ ختم کر کے اُٹھنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

لیکن بنگالی نوجوان کی طرف سے میرا خیال فوراً ہی ہٹ گیا میں پھر رات کے وقت ٹھہرنے کی فکر میں لگا رہا۔ اب مجھے ہلکی ہلکی سی نیند بھی آنے لگی تھی سخت فکر ہوئی۔ پارک میں اِکا دُکا آدمی باقی رہ گئے تھے میں بنچ پر لیٹ گیا۔ دل چاہا کہ کوئی درد بھرا گیت گاؤں۔ اور خوب جی کھول کر روؤں مگر نہ گا سکا نہ رو سکا۔ پارک کے چاروں طرف سڑک کے بعد عالیشان مکانات تھے میں نے حسرت بھری نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ اور دل میں ایک ہوک اُٹھی میں نے فیصلہ کر لیا کہ آج کی رات پارک ہی میں کاٹ دوں گا۔

میں یہی باتیں سوچ رہا تھا کہ پارک کے پہرہ دار نے آ کر مجھے اُٹھایا اور کہا۔

"بابو صاحب یہاں سونے کا حکم نہیں ہے۔"

میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھا اور بولا۔

"میں سو نہیں رہا ہوں ——"

"اب جائیے گھر گیارہ بج رہے ہیں۔ اب پارک کے دروازے بند کر دوں گا۔"

میں نے بڑے تالاب کو دیکھا۔ جو پارک کے بیچوں بیچ میں تھا۔ ٹھہرے پانی پر آس پاس کے مکانات میں جلنے والی بجلی کے قمقموں کا عکس کھیل رہا تھا۔ میرے دل و دماغ کی عجیب کیفیت ہو گئی اب کہاں جاؤں۔ گیارہ بج رہے ہیں۔ اس وقت کون جگہ دیگا۔ آخر ایک دوست یاد آ گیا۔ صفدر۔

لیکن صفدر اس جگہ سے پانچ میل کی دوری پر رہتا تھا۔ سوچنے لگا۔ کیسے جاؤں؟ چلنے کے لئے کوئی سواری بھی نہ تھی۔ اور ٹہلتے ہوئے پہنچ جانا سخت مشکل تھا معلوم ہوا جیسے کسی نے امید کے چراغ کو پھونک کر بجھا دیا میرے سارے بدن میں گرمی پھیل گئی۔ یکایک وحشت کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ دل چاہا کہ اس تالاب میں کود کر جان دیدوں کہ اس قسم کی لاابالی زندگی کا خاتمہ ہو جائے

میں پارک سے سوچتا ہوا نکلا۔ آخر یہ زندگی کیا ہے؟ صبح سویرے اٹھتا ہوں معمولی سا ناشتہ کر کے کام کی تلاش میں نکلا ہوں۔ جہاں جو کچھ مل گیا۔ کھالیا۔ کبھی دوستوں کے چائے پر ہی سارا دن کٹ گیا۔ قرض پر ساری امید ہے۔ نہ رہنے کا ٹھکانا اور نہ کھانے کا۔ اب اس وقت کہاں جاؤں کس کا دروازہ کھٹکھٹاؤں۔ میرا کونسا ایسا ہمدرد بیٹھا ہے جو اس وقت پناہ دیگا۔

میں بڑھتا چلا گیا جتنا زیادہ سوچتا تھا کہ کہاں رات کو پناہ لیجائے۔ دماغ اتنا ہی زیادہ الجھتا تھا۔ کوئی بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔ آخر میں نے فیصلہ کیا کہ کسی درخت کے نیچے فٹ پاتھ پر پڑ رہوں —— سڑک کے کنارے پر درخت کو دیکھتا جاتا تھا کہ کوئی مناسب درخت ملجائے۔ جس کے نیچے چھپ کر زمین پر لیٹ سکوں۔ لیکن کوئی ایسا درخت بھی نظر نہ آتا تھا معلوم ہوتا تھا کہ ساری دنیا میں میرے لئے پناہ کی کوئی جگہ باقی نہ رہی۔

یکایک ایک بازاری نوجوان بیچ سڑک سے گاتا ہوا گذرا ؎

"کوٹھے پر جو نظر گئی۔ دل پہ چھری چل گئی۔ بانکی البیلی پتریا کرے ہے انتظار"۔ . . .

یکایک معلوم ہوا جیسے ساری مشکل حل ہو گئی۔ بس آج کی رات پتریا کے گھر۔ بہت سے لوگ وہاں جاتے ہیں۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا جھن سے آواز آئی۔ سوچا آج کی رات تو

مزے سے کٹ جائے۔ کل دیکھا جائے گا۔

لیکن جیب میں اتنے پیسے نہ تھے۔

وہ رات مجھے آج تک یاد ہے ——— ◆

بخیر تمام

بوڑھے رام داس کو ایک ہی کام کرتے بائیس سال گزر چکے تھے۔ ایک ہی کام کسی دن بھی رفتار کار میں کوئی فرق نہیں آیا۔

صبح سویرے اُٹھ کر دور تک ریلوے لائن کو دیکھ آتا۔ کہ کہیں کوئی خرابی تو نہیں ہے۔ پھر اپنی "گمتی" میں واپس چلا آتا اور بہت سے ایسے کام کرتا جس سے چند پیسوں کی روزانہ آمدنی بڑھ جائے "گمتی" کے بغل سے شہر کی طرف سڑک جاتی تھی۔ یہ سڑک گمتی کے پاس ریلوے لائن کو کاٹتی تھی۔ لائن کے دونوں طرف سڑک پر لوہے کا دروازہ تھا جس پر اُسے کامل اختیار تھا اس اختیار سے وہ بعض ناجائز فائدے بھی اُٹھا لیا کرتا تھا۔ شہر کو جانے والی گاڑیوں سے ہلکا پھلکا ٹیکس وصول کر لیا کرتا۔ اس ٹیکس میں پاٹ خاص طور پر ملتا تھا جس سے وہ بہت ہی باریک ڈوری بٹتا اور بازار جا کر بیچ دیا کرتا۔

ریل گاڑیوں کے آنے کے وقت وہ بہت مستعد رہا کرتا تھا۔ دونوں طرف کے دروازے بند کرکے وہ اُس وقت تک نہ کھولتا جب تک گاڑی چلی نہ جاتی۔ اُس وقت بڑی سے بڑی رشوت بھی وہ قبول نہیں کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بائیس برس کی لمبی مدت میں اس کی گمتی کے راستے پر ایک حادثہ بھی نہیں ہوا تھا۔ ہمیشہ یہی دیکھا گیا کہ دن کے وقت دروازے بند کرکے وہ ہری جھنڈی اور رات کے وقت ہری بتی دکھا رہا ہے اور دروازے کے دوسری طرف کے آدمیوں کو سمجھا رہا ہے۔

اُسکا نام کم لوگ جانتے تھے۔ عام طور پر اُسے جمعدار کہا جاتا تھا۔ اور وہ خود بھی اپنے آپ کو جمعدار ہی سمجھتا تھا۔ کبھی کبھی وہ دروازہ بند کرکے بیل گاڑیوں کا راستہ روک دیتا اور بیل گاڑی والے ضد کرتے۔ کہ انہیں جانے دے تو وہ کہہ دیا کرتا "اس وقت لاٹ صاحب بھی کہیں۔ تو پھاٹک نہیں کھل سکتا۔" اس وقت گاڑی والوں اور مسافروں کی خوشامد میں اُسے بڑا لطف آتا۔

صبح سویرے جب وہ دور تک لائن دیکھ کر واپس آیا۔ تو اُس نے دیکھا کہ گمتی کے پاس ہی ٹرالی کھڑی ہے۔ ٹرالی پر لال جھنڈی لگی ہے صاحب بیٹھا ہے۔ اور چار قلی کھڑے ہیں۔ رامداس نے دیکھتے ہی جھک کر سلام کیا۔ لیکن صاحب نے کی اور وہ بھی ہندستانی "صاحب" کی سب سے بڑی شان یہ ہوتی ہے۔ کہ وہ اپنے ماتحت کام کرنے والوں سے اچھی طرح بات نہیں کرتا۔ چنانچہ رامداس کے سلام کا جواب صاحب نے منہ بنا کر دیا۔

"تم اتنا دیر کہاں گیا تھا ——— ؟"

رامداس صاحب کا رنگ دیکھ کر سہم گیا۔ اور بولا

"صاحب باہر لاٹ صاحب گیا تھا —— "

صاحب نے اُسی شان کے ساتھ منہ بنا کر جواب دیا۔

"اور برا کام کرو۔ اچھا میں —— جتا کاون ادھر سے لاٹ صاحب کا اسپیشل جائیگا تم اپنا لائن اور گمٹی صاف رکھے گا سن لیا —— "

رام داس نے گردن جھکا کر اُس کا جواب دیا۔

"ہاں صاحب!"

قلیوں نے ٹرالی کو دھکا دیکر آگے بڑھایا پھر دوڑنے لگے۔ ٹرالی تیزی سے چلنے لگی۔ رام داس دیر تک اُدھر دیکھتا رہا۔ صاحب کی شانِ بے نیازی۔ اُس کا رُعب اُس کے کپڑے اُس کا تکم بڑے آدمی کی بڑی بات۔

جب صاحب کی ٹرالی نظر سے اوجھل ہونے لگی۔ تو وہ اپنی جگہ پر واپس آیا۔ اُسکی بیوی کھڑی صاحب کی باتیں سُن رہی تھی اور انتظار کر رہی تھی۔ کہ صاحب جائے۔ تو رامداس کو کھچڑی کھانے کو کہے۔ اُس کو فکر تھی۔ کہ کھچڑی ٹھنڈی ہوجائے گی۔ تو بدمزہ ہوجائیگی۔ اُس نے لہسن مرچ کا کوچا" خاص طور پر بنایا تھا۔ دھنیا کا ہرا پیا پتلا پتلا کاٹ کر اُس نے کوچا میں ملایا تھا۔ اور رام داس کو ایسا کوچا بہت پسند تھا۔ اور وہ خوش تھی۔ کہ دوسرے دنوں سے زیادہ کھانا کھائے گا۔

رامداس واپس آیا تو بہت خوش تھا ہر روز کی طرح۔ صاحب کی باتوں کا اُس پر کوئی اثر نہ تھا۔ اس قسم کی باتیں تو روز ہی ہوا کرتی ہیں۔ اس قسم کی باتیں سننا اور خواہ مخواہ کی افسروں کی جھڑکیاں سہنا، چھوٹے کام کرنے والوں کی ڈیوٹی میں شامل ہے۔ اسلئے وہ اگر کچھ خیال کرتا تو احمق تھا

لیکن اس کی بیوی نے سوال کر ہی دیا۔

"صاحب کا ہے کو بول رہا تھا —— ؟"

"رام داس نے اپنی ٹوٹی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

جھوٹ موٹ کچھ نہ کچھ بگڑنا افسر کا کام ہے —— ہاں کا پکا ہے۔ لاؤ تو —— اور ذرا ناریل چڑھا دے"۔

اُس کی بیوی کوٹھری میں چلی گئی۔ رام داس نے گمٹی کو دیکھا چھوٹے سے سائبان میں کھانا پکانے کی وجہ سے چھت اور دیوار دھواں سے کالی ہو گئی تھی۔ اُس نے سوچا۔ کہ اب کوئی گاڑی شہر سے چونا لیکر جائے گی۔ تو تھوڑا سا چونا اُس سے لے لیگا۔ تھوڑا سا چونا اس سائبان کی سفیدی کے لئے کافی ہوگا۔ پھر اُس نے اپنی لگائی ہوئی ننھی سی پھلواڑی کو دیکھا۔ جو گمٹی سے ملی ہوئی زمین میں اُس نے بڑی محنت سے لگائی تھی۔ اُس ننھی سی پھلواڑی میں گمیندا، جٹا دھاری سورج مکھی، بیلا اور کنیل کے لال پیلے اور اُجلے پھول کھلے تھے۔ عشق پیچاں کی بیل بانس کی قمچی کے سہارے چڑھ کر گمٹی کے اوپر پہنچ چکی تھی۔ اور گمٹی کا نمبر ۲ آدھا ڈھک گیا تھا۔ لہلہاتے ہوئے پھولوں کو دیکھ کر اُس کا دل خوش ہو گیا۔ اتنے میں اس کا طوطا بول اُٹھا "اٹھو۔ اٹھو کھاؤ" طوطا جو کچھ سنتا تھا۔ وہی دہراتا تھا۔ اور جب رام داس چارپائی چھوڑ کر کھانے پر بیٹھا۔ تو طوطے نے رام داس ہی کی سکھائی ہوئی بات دہرائی۔ "پہلے کہو رادھے شیام رادھے کرشن، پھر کھاؤ بیٹا"۔

رام داس نے طوطے کو دیکھا بیساختہ اُسکے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور بولا۔

"اچھا اچھا —— بیٹا"

یہ کہتے ہوئے رام داس اُٹھا۔ اور تھوڑی سی کھچڑی طوطے کی کٹوری میں دے کر بولا۔

"پہلے کہو رادھے شیام رادھے کرشن، پھر کھاؤ بیٹا۔"

لیکن طوطا باتوں کو دہرا سکتا ہے حکم کی تعمیل اُس کے بس سے باہر ہے۔ اُس نے بغیر رادھے شیام رادھے کرشن کہے کھانا شروع کر دیا۔ رام داس نے بھی۔

رام داس کو کھانے میں بڑا مزہ آیا۔ اُسی وقت اُس نے اپنی بیوی سے کہا۔

"چھٹی ملے تو مچھلی مار لائیں۔ بہت دن ہوئے مچھلی کھائے۔ ایک جگہ کھانے میں مچھلی ہے پانی بھی تھوڑا ہے اور پچھواڑے میں نُنیا کا ساگ بھی ہے بڑا مزہ آئے گا۔"

اُس کی عورت نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔
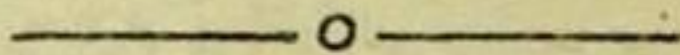
رام داس کو جب سے صاحب نے آکر خبر دی، کہ لاٹ کی اسپیشل جانیوالی ہے۔ وہ اپنے کاموں میں لگ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اُسے کیا کام کرنے ہونگے۔ اُس کو کسی سے کچھ پوچھنا نہ تھا۔ وہ بائیس سال کی مدت سے یہی کام کرتا آیا تھا۔ ایک دو بار نہیں بیسیوں مرتبہ لاٹ صاحب کی گاڑی اُدھر سے گزر چکی تھی۔

جمعہ کا دن آگیا۔ اُس نے اپنے علاقہ کی لائن دیکھ لی۔ ہر جگہ دیکھ لی۔ ہر جگہ اچھی تھی۔ لائن کے دونوں طرف کی گھانس اُس نے خود ہی صاف کی تھی۔ گمٹی کا سائبان جو کالا ہو گیا تھا۔ اب وہ بھی مانگے کے چونا سے سفید ہو چکا تھا۔ ٹوٹی ہوئی چارپائی کو اُس نے گمٹی کے پیچھے رکھ دیا تھا گیندا، بیلا، جٹا دھاری اور کنیل کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ عشق پیچاں کی بیل بانس کی تیچی

کے سہارے چڑھ کر گمتی کے اوپر پہنچ چکی تھی۔ اُس نے ہر طرف نگاہ دوڑائی۔ اُس کا دل خوش ہو گیا اُس کی بیوی نے ناریل چڑھا دیا۔ اور وہ ٹہل ٹہل کر پینے اور دھواں اڑانے لگا۔

اُسے دور سے مال گاڑی آتی دکھائی دی۔ رام داس نے دوسری طرف کا دروازہ بند کر دیا۔ پھر گمتی کی طرف کا اور اطمینان سے بیٹھ کر ناریل پینے لگا۔ مال گاڑیوں کے آنے پر وہ لوگ مطمئن ہاتے تھے۔ اُس کی عورت سائبان میں بیٹھی ہوئی، اُس کی لائی ہوئی مچھلی بنا رہی تھی۔ پھلواڑی میں سے نُنیا کا ساگ پہلے ہی وہ لا کر صاف کر چکی تھی۔

رام داس بے چینی سے وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ لاٹ صاحب کی سپیشل چلی جائے تو پھر اطمینان نصیب ہو۔ بہت سی پسنجر اور مال گاڑیاں آئیں اور چلی گئیں۔ اُس نے اپنا کام مستعدی سے کیا۔ لیکن اُس کو یہی محسوس ہوتا رہا۔ کہ یہ سب ضمنی کام تھا۔ اصل کام باقی ہے۔

آخر وہ وقت بھی قریب آگیا، جب لاٹ صاحب کی اسپیشل ٹرین گزرنے والی تھی۔ ایک گھنٹہ سے پہلے ڈپٹی صاحب کہہ گیا کہ اسپیشل آنے میں اب زیادہ دیر نہیں ہے۔ لائن پر جگہ جگہ چوکیدار کھڑے کر دیئے گئے۔ تاکہ لائن کو کوئی بدمعاش خراب نہ کرنے پائے۔

سورج ڈوبتا جا رہا تھا۔ اور بہت ہی ہلکی ٹھنڈک پیدا ہو چلی تھی۔ اب وقت بہت کم تھا۔ شائد دس منٹ لاٹ صاحب کی اسپیشل ٹرین کا کوئی خاص وقت مقرر تو تھا نہیں۔ اُس کی بیوی نے کہا۔ کہ مچھلی پک گئی کھا لو۔ لیکن اُس نے جواب دیا۔ "اب گاڑی چلی جائے تو اطمینان سے کھائینگے۔"

وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور دوسری طرف کا دروازہ بند کرنے چلا۔ ایک دو بیل گاڑیاں دروازے سے اِدھر آچکی تھیں۔ چار پانچ اُدھر باقی رہ گئی تھیں۔ جو دوسری طرف رہ گئیں۔ اُسکے گاڑیبان

ضد کر رہے تھے۔ کہ جب اُن کو جانے دیا۔ تو ہمیں بھی جانے دے۔ رامداس نے پہلے سمجھایا پھر اپنی نوکری کا واسطہ دیا۔ خوشامدیں کیں لیکن گاڑیبان موٹی عقل کے ہوتے ہیں۔ کوئی بات اُنکی سمجھ میں آسانی سے آتی کب ہے۔ وہ اپنی ضد پر قائم تھے۔ دوسری طرف کا دروازہ کھلا تھا۔ ایک دو گاڑی والے جو دوسری طرف سے آ رہے تھے۔ اُسی طرف رُک گئے۔

بحث جاری تھی۔ رام داس سمجھا رہا تھا۔ گاڑیبان الجھ رہے تھے۔ وہ دوسری طرف کا دروازہ بھی بند نہ کر سکا۔ شاید یہی گاڑیبان "پھاٹک" کھول کر گاڑی ہانک دیں۔ جب سارا سمجھانا بیکار ہوا تو اُس نے صاف کہدیا۔

"اس وقت اگر لاٹ صاحب بھی کہیں۔ تو دروازہ نہیں کھل سکتا۔"

ایک جوان گاڑیبان اس کا مذاق اُڑا کر ہنسنے لگا۔ رام داس نے اپنے لفظوں پر زور دے کر کہا۔

"ہاں ہاں ——"

یکایک گاڑی کے آنے کی آواز اُس کے کانوں میں آئی۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ لاٹ کی اسپیشل ٹرین بہت قریب آچکی تھی۔ دوسری طرف کا پھاٹک کھلا ہوا تھا۔ اب کیا ہوگا؟ ڈیوٹی میں بے فکری۔ نوکری کا چلے جانا تو ضروری بات تھی۔ اگر نہ بھی گئی۔ تو لمبی ڈانٹ تو ضروری تھی۔"

وہ بوکھلا سا گیا۔ کچھ نہیں سوچ سکا۔ تیزی سے وہ بڑھا کہ لائن کو پار کر کے گاڑی کے جانے سے پہلے پھاٹک بند کر دے لیکن وہ بند نہ کر سکا۔ لاٹ صاحب کی اسپیشل ٹرین گذر گئی۔ لائن کے ایک طرف رامداس کی لاش کے ٹکڑے جیسے قصاب کی دوکان سے آیا ہوا گوشت

اُس کی عورت روتی چلاتی رہی ——— اور ڈوبتے ہوئے سورج کی مٹتی ہوئی روشنی میں لاٹ صاحب کی اسپیشل ٹرین تیزی سے چلی گئی۔

دوسرے دن اخبارات میں خبریں موٹے حرفوں میں چھپیں۔

"لاٹ صاحب کی اسپیشل ٹرین بخیریت تمام پہنچ گئی"

(اس کہانی کا مرکزی خیال ایک بنگالی کہانی سے لیا گیا ہے)

بے چارہ

آج رحمو کو اپنی بیوی دن بھر یاد آتی رہی۔ جب وہ سر پر اینٹوں کی ٹوکری رکھ کر تیسری منزل پر اُسے رکھنے جاتا، تو بھی اُسکی میٹھی یاد اُسے ستاتی رہتی۔ کام میں اُس کا دل بالکل نہیں لگتا۔ اور نہ کام کام جیسا معلوم ہوا۔ دو سال کی لمبی مدت میں رجیا کی یاد نے اسے اتنا زیادہ کسی دن بھی نہ ستایا تھا کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ وہ یاد آئی، دل مچلا، جی چاہا کہ جا کر اُس سے مل آئے، مگر پھر جی بہل گیا، ساری کسک مٹ گئی —— اسکا بڑا بھائی دس دنوں کیلئے اور کبھی ان سے بھی زیادہ دنوں کے لئے گھر جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ روپے کما کر بھیجتا اور جب جاتا، تو اپنی بیوی بچے کے لئے اچھے اچھے کپڑے اور بہت سی چیزیں خرید کر لے جاتا تھا۔ اسلئے اُس کے بھائی کی اپنے محلے میں، اپنے پرائے میں بڑی تعریف ہوتی تھی۔ رحمو بھی اس بات کو سمجھ گیا تھا، کہ اصل بڑائی اس میں ہے کہ پردیس میں جا کر کمائے، ہر مہینے بیوی کو

روپیہ بھیجے اور سال دو سال پر بہت سی چیزیں خرید کر اپنے ساتھ گھر لے جائے۔ اس سے بیوی بھی خوش
رہتی ہے اور اپنے پرائے میں بھی نام ہوتا ہے۔

اسی لئے رگھو بیاہ کے ایک مہینہ بعد ہی پردیس چلا آیا۔ دو برس تک روز کام کرتا اور ہر ماہ بیوی
کو کچھ روپے بھیج دیتا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس سے بھی زیادہ بھیجے۔ مگر کمائی تھوڑی تھی۔ زیادہ بھیجنا مشکل تھا۔ ہر
ہفتہ گھر سے خط آتا تھا۔ خیریت معلوم ہو جاتی تھی۔ اسے اطمینان تھا کہ وہ اپنا فرض پوری مستعدی کے ساتھ
ادا کر رہا ہے۔ اس دوران میں رجیا اسے اکثر یاد آتی رہی اور خاص کر رات کو سوتے وقت جب اسکو کوئی کام نہ ہوتا۔
وہ دن بھر کا تھکا ماندہ اپنی چٹائی پر پاؤں پھیلا کر سو جاتا تھا۔ مگر آج اسے رجیا بہت یاد آ رہی تھی۔
بات یہ ہوئی کہ جب وہ کام پر جانے لگا۔ تو شاہ جی پان والے نے پکار کر اسے ایک لفافہ دیا وہ سمجھ گیا
کہ رجیا کا خط ہے۔ اس نے جیب میں رکھ لیا۔ اور سوچا کہ راستے میں دلو سے پڑھوا لیگا وہ پڑھا لکھا آدمی ہے
جب دلو کے یہاں پہنچا تو اس نے اسے کچھ چیزیں کھلائیں۔ جو اسکی بیوی نے بنا کر بھیجی تھیں۔ رگھو کو
ایک جھٹکا سا لگا۔ رجیا صرف خط لکھا کرتی ہے پر کبھی کوئی چیز بنا کر نہیں بھیجتی۔

مگر جب دلو نے اسے خط پڑھ کر سنایا تو اس کا دل سو سو کروٹیں لینے لگا۔ رجیا نے یہ خط چپ
چاپ ایک لڑکے سے لکھوا کر بھیجا تھا۔ اور بڑی آرزو کے ساتھ اسے بلایا تھا۔ اسی لئے کام پر
پہنچتے ہی رگھو نے منشی جی سے حساب صاف کرنے کو کہہ دیا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ دن بھر کام کریگا
شام کو روپے لیکر واپس آئیگا۔ کچھ چیزیں خریدے گا۔ پھر رات کی گاڑی سے روانہ ہو کر دوسرے دن
شام تک گھر پہنچ جائیگا۔ لیکن منشی نے حساب صاف نہیں کیا۔ ابھی مہینہ پورا ہونے میں بہت دن باقی
تھے۔ کام زیادہ تھا اور آدمی کم تھے۔ رگھو کو منشی جی پر دن بھر غصہ آتا رہا اور رجیا کی یاد دن بھر ستاتی رہی

وہ کام ختم کر کے جب واپس ہوا۔ تو اسکے دماغ میں صرف ایک بات چکر کاٹ رہی تھی۔ گھر کیسے جائے حساب نہیں ہوا صرف تین روپے پاس ہیں۔ چھ روپے کے قریب ریل کا کرایہ ہے۔ پھر رجیا کے لئے سوغات یہ سب کہاں سے آئیگا۔ اس نے سوچا کہ کسی سے قرض لے لیکن قرض دینے والا کوئی نہ تھا۔ اس کا دل مچل مچل کر رہ جاتا۔ رجیا کے بغیر گھر سے دور، پردیس میں وہ اپنی زندگی کو سوکھی ندی کی طرح اداس محسوس کرنے لگا۔ وہ سوچنے لگا۔ یہ بھی کیا زندگی ہے۔ دن بھر محنت مزدوری کرتا ہے رات کو سو رہتا ہے۔ بیوی سے دور ہے۔ ہر مہینہ روپے جمع کر کے بھیج دیتا ہے۔ جس کے لئے کماتا ہے اسی سے دور ہے۔ یہ تو حد درجہ کی بدنصیبی ہے، عورت کے بغیر زندگی ہی کیا؟

اس کا گھر سینکڑوں میل دور تھا اور وہ جلدی پہنچ بھی نہ سکتا تھا۔ اس کو اپنی مجبوری کا پورا پورا احساس ہوا۔ دل دھڑکنے اور کڑھنے لگا۔ اس نے سوچا۔ وہ لوگ کیسے خوش نصیب ہیں جو اپنی بیوی کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں۔

اس کو رجیا کی ایک ایک بات یاد آنے لگی۔ بیاہ کے بعد پہلی رات اسکا بدن سمٹائے بیٹھے رہنا۔ آنکھیں بند کئے گٹھڑی کی طرح بندھی رہنا۔ ذرا سا بدن چھو دینے پر اس کا اور بھی بدن چرانا اپنا بار بار چھیڑنا۔ اور رجیا کا سہم سہم جانا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے دل سے ڈر کا مٹنا۔ لجائی لجائی آنکھیں، لجائی لجائی مسکراہٹ، لجائی لجائی باتیں ——— اور بہت سی باتیں ———

معلوم ہوا جیسے کسی نے اس کا دل لیکر مسل دیا ہو۔ اسے محسوس ہونے لگا۔ جیسے عورت کے بغیر انسان کی زندگی بغیر چراغ کا گھر ہے۔

اس کے قدم بہت ہی آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے جتنی دیر میں وہ آدھا راستہ طے کر سکا

تھا۔ اتنی دیر میں وہ گھر پہنچکر کھانے کا سامان درست کرنا شروع کر دیتا تھا۔ وہ کبھی سوچتا تھا۔ کہ جس طرح ہو آج رات کی گاڑی سے گھر روانہ ہو جائے کبھی سوچتا، مہینہ پورا کر کے جائے۔ دو تین مہینے ڈٹ کر رہے۔ بلکہ آتے وقت رجیا کو بھی ساتھ لیتا آئے۔ اُس کے آجانے سے بہت آرام ہوگا۔ مگر پھر وہ رہے گی کہاں؟ ایک کوٹھری میں تو چار آدمی رہتے ہیں کم سے کم اسکے لئے ایک اکیلی کوٹھری چاہئے مگر کوٹھری کا کرایہ چار روپیہ ہے ——— یہ کہاں سے آئے گا؟ اسکا دماغ چکرا کر رہ گیا۔ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔

تھوڑی دور پر ایک عورت جاتی ہوئی نظر آئی۔ اُس نے سوچا رجیا بھی اسی طرح اپنے گاؤں میں پھرتی ہوگی۔ لیکن اسکے بعد ہی رجیا کا خیال اُس کے دل سے ہٹ گیا۔ اور صرف عورت کا خیال رہ گیا۔ صرف عورت کا۔ اُس نے سوچا، مرد کے لئے دنیا میں سب سے بڑی نعمت عورت ہے۔ جب یہ ملجاتی ہے تو آدمی کی زندگی سنور جاتی ہے۔ کھانا پکا کر کھلاتی ہے۔ بدن اور سر داب دیتی ہے۔ ہر طرح کی خدمت کرتی ہے جب بیٹھکر باتیں کرتی ہے تو آدمی ساری تھکن کو بھول جاتا ہے۔ پھر اسی سے بال بچہ ہوتا ہے۔ ہر طرح کا آرام ہر طرح کا سکھ!

عورت کو اُس نے پھر غور سے دیکھا مگر وہ ذرا دور جا چکی تھی ——— اُس کی صورت بھی وہ نہ دیکھ سکا۔ مگر پھر بھی پلٹ پلٹ کر اُسے دیکھتا ہی رہا ——— ساتھ ہی اُس کو سمندری یاد آگئی جو ہر روز اُس کے ساتھ کام کرتی تھی۔ اُس کی جوانی تو ڈھل چکی تھی مگر پھر بھی بُری نہ تھی رنگ بھی چمپئی تھا۔ رحمو کو سمندری کو یاد کر کے بڑا لطف آیا۔ اُس نے سوچا کہ کل اس سے بات کرے گا۔ وہ اپنی عادت کے مطابق ہنسکر جواب دیگی۔ اُسے ایک بات اور یاد آگئی۔ لوگ کہتے ہیں کہ سمندری

پر منشی جی تو نہ بجھے ہیں۔ اور اُس کی عزت لے چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اس کا بہت خیال کرتے ہیں۔ اب بھی وہ کبھی کبھی اُن کے گھر جایا کرتی ہے۔

یہ خیال آتے ہی اسے سمندری اور منشی جی دونوں سے نفرت سی ہونے لگی۔ مگر ساتھ ہی اُسے یہ بھی خیال آیا۔ کہ اگر سمندری اُسے بھی ایک دن مل جائے۔ تو کچھ بُری نہیں۔ بلا سے بے عزت ہے اس سے بیاہ تھوڑے ہی کرنا ہے سمندری اُسے مل جائے اس خیال ہی سے اُسے بہت لطف آیا اور امید بندھ گئی۔ کہ سمندری ضرور مل جائے گی۔ اسکے قدم ذرا تیز اُٹھنے لگے۔ اور ساتھ ہی اُس کے ہونٹ بھی ہلنے لگے۔ وہ منہ ہی منہ میں گا رہا تھا۔

تورے نین ہیں زہر کے پیالے   تورے چتون ہیں آرے کٹار

وہ مزے سے بے کر و سر اتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ اسے سمندری یاد ہی نہ رہی اب ہلکے ہلکے سُروں میں گاتا ہوا اپنے ڈیرے کی طرف جا رہا تھا۔ اسی طرح کسی کے نین اور چتون کا راگ یاد رہ گیا تھا ـــــ یکایک اُس کی نظر ایک جوان عورت پر پڑی۔ جو سر پر ٹوکری رکھے چلی جا رہی تھی۔ رحمو نے گانا شروع کر دیا ؎ جانی جوبن پہ نہ اترایا کرو

عورت شرما گئی اور تیزی سے قدم اُٹھانے لگی۔ رحمو کو اپنی اس حرکت میں بڑا مزا آیا اور وہ کھڑا ہو کر عورت کو دیکھنے لگا۔ وہ جلدی جلدی قدم بڑھائے چلی جا رہی تھی۔ جب وہ دور چلی گئی تو رحمو پھر بڑھا اور وہی گاتا ہوا ؎ جانی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسے بار بار گانے سے بڑا مزا آ رہا تھا۔ یکایک کسی نے پوچھا

"کس سوچ میں ہو رحمو ؟"

رحمو نے پلٹ کر دیکھا۔ یہ شاہ جی پان والے تھے۔ رحمو ان کی دکان پر پہنچا اور پان کی فرمائش

کی۔ شاہ جی نے پوچھا۔

"کیا سوچ رہے تھے تم؟"

رحمو نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کوئی عورت، شاہ جی بڑی موہنی ہوتی ہے!"

شاہ جی داڑھی کو کھجاتے ہوئے بولے

"کیوں ریجھ گئے کسی پر؟"

رحمو نے جواب میں ہنس کر بتیسی دکھادی۔ شاہ جی پانچوں وقت پابندی سے نماز پڑھتے تھے۔ اور سب کو اچھے کام کرنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ لیکن ہر قسم کی بات میں دلچسپی لیا کرتے تھے اور پاس رہنے والے مزدوروں کے خط لکھتے اور پڑھتے تھے۔ سب کو کرید کرید کر اسکا حال پوچھتے اور کبھی دعا تعویذ سے مدد بھی کرتے تھے۔ بڑے شریف مشہور تھے۔ رحمو نے ذرا کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

"نہیں جی ———"

اور دکان میں لگے ہوئے آئینے میں اپنی صورت دیکھنے لگا۔ آئینے کے پاس ہی ایک اچھی سی تصویر تھی۔ باغ میں ایک عورت اور ایک مرد ——— رحمو کو تصویر بڑی اچھی معلوم ہوئی۔ اس نے پوچھا۔

"یہ تصویر کہاں سے ملی شاہ جی؟"

"کیوں؟" شاہ جی نے پوچھا۔

"بڑی اچھی تصویر ہے!" رحمو بولا۔

شاہ جی مسکرائے اور بولے۔

"آج کیا بات ہے رحمو بڑے خوش نظر آتے ہو؟"

رحمو نے شرما کر کہا۔

"پان دیجیے شاہ جی!"

مگر شاہ جی نے اُس کو پھسلا کر پوچھ ہی لیا۔ رحمو نے سندری کا سارا قصہ سنا دیا شاہ جی مسکرائے۔ رحمو کی ہمت بڑھ گئی اور اُس نے ایک تعویذ کی فرمائش کر دی۔ شاہ جی نے کہا۔

"اچھا اگلی جمعرات کو ——"

اب رحمو کی ہمت اور بڑھ گئی۔ نفسانی خواہشات کی تکمیل کی ناکام تمنا دل میں کروٹ لینے لگی۔ شاہ جی نے اُسے رنگ میں دیکھ کر پوچھا۔

"اچھا رحمو بتاؤ۔ تم نے کبھی کسی دوسری عورت سے محبت کی ہے؟"

رحمو جیسے اچھل پڑا۔ بولا۔

"ہاں جی —— بیاہ سے پہلے ایک تھی جو مجھ پر جان دیتی تھی۔ اس کا بھی بیاہ ہو گیا ہم لوگ سورج ڈوبنے پر ادھر کے کھیت میں ملا کرتے تھے —— وہاں گھنٹوں پیار اور محبت کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ بہت سی باتیں شاہ جی! بڑی اٹھتی جوانی تھی اس کی ——"

شاہ جی مسکراتی ہوئی نگاہوں سے رحمو کو دیکھتے رہے۔ رحمو نے دیکھا تو سمجھا، کہ شاہ جی کو یقین نہیں ہو رہا ہے۔ بولا:

"قسم ہے شاہ جی! ایک ایک لفظ سچ کہہ رہا ہوں۔ اس کا بدن اتنا نرم تھا ——

آہاہا ——— اور آنکھیں! بس آم کے پھانک!"

مگر دل میں وہ سمجھ رہا تھا کہ ایک ایک لفظ جھوٹ کہہ رہا ہے، ساری کہانی من گھڑت ہے ——— شاہ جی نے رحمو کو پان دیا۔ وہ پان کھا کر دیر تک سامنے کے آئینے میں طرح طرح سے اپنی شکل دیکھتا رہا۔ اور بازاری گیت گاتا رہا۔

یکایک اُس کے ایک ساتھی نے پکارا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ اور گاتا ہوا اس طرف چلا ——— مگر پھر پلٹ کر شاہ جی سے کہتا گیا۔

"شاہ جی جمعرات کو تعویذ لکھنا نہ بھولئے گا!" ٭

جوانی

بیاہ ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا مگر سریندر نے پربھا سے ایک لفظ بھی نہ کہا تھا۔ وہ باہر سے آتا اور چپ چاپ پربھا کے پاس بیٹھ جاتا۔ کبھی کوئی کتاب اُٹھا لیتا۔ کبھی کوئی رسالہ اور وقت کاٹ دیتا۔ پھر باہر چلا جاتا۔ ماں باپ نے اُسکا بیاہ کر دیا تھا۔ وہ اُن کی خوشی، برادری میں عزت اور وقعت پر اپنی ساری خوشیوں اور تمناؤں کو قربان کر چکا تھا۔ اور رسماً سارے کام کرتا جا رہا تھا۔ ورنہ اُسے بیاہ کی کوئی خوشی نہ تھی۔ بلکہ حد درجہ رنج تھا۔

آج جب وہ باہر جانے کیلئے کپڑے بدلنے کو کمرے میں آیا۔ تو پربھا سنگار میز کے سامنے بیٹھی بال سنوار رہی تھی۔ اُس نے سریندر کو دیکھتے ہی شرما کر اپنی نظریں نیچی کر لیں۔ اور بدن سمٹا کر بیٹھ گئی۔ سریندر پر اسکا بہت اثر ہوا۔ اُس نے اپنے دل میں پربھا کیلئے ہمدردی محسوس کی۔ اُس کے سینے کی گہرائیوں

سے ایک آہ نکلی اور سینے ہی میں ڈوب کر رہ گئی۔ کپڑے بدلنے کا خیال اسکے دماغ سے نکل گیا اور وہ ایک تھکے ہوئے شخص کی طرح ایک صوفے پر گر پڑا اور سوچنے لگا ـــــ میں کیا کر سکتا ہوں۔ ماتا پتا کی ضد نے میرے ساتھ ایک غریب لڑکی کی زندگی بھی برباد کر دی ہزار پڑھی لکھی ہے۔ مگر پھر بھی ہندوستانی لڑکی ہے۔ اسی سماج میں سانس لیتی ہے جسمیں عورتیں رسم اور رواج کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہیں۔

بیاہ ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا۔ مگر پربھا کے چہرے پر ایک مرتبہ بھی ہنسی اور خوشی کی جھلک نظر نہ آئی۔ وہ برابر اداس رہتی ہے جیسے پت جھڑ میں پھلواری جیب بھوا ایک گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی ہے ـــــ وہ خوش رہے تو کیونکر؟ عورت کی ساری ہنسی خوشی پتی کے دم سے ہے میں اس سے نہ بولتا ہوں اور نہ ہنستا ہوں۔ وہ گھر سے ماں باپ سے اور اپنے پرائے سے جدا ہو کر آئی ہے۔ اور اس پر میرا سلوک ـــــ آخر غریب خوش کیونکر رہے؟ میں نے کبھی جھوٹے منہ بھی تو اسکا حال نہ پوچھا ـــــ ہاں یہ صحیح ہے کہ میں اسے محبت نہیں دے سکتا لیکن ایک انسان کی طرح ہمدردی تو کر سکتا ہوں۔ دنیا تو اب یہ جانتی ہے کہ اسکی ہر قسم کی خوشی کی ذمہ داری میرے سر پہ ہے۔ دل سے نہ سہی لیکن سماج کے سامنے تو اس ذمہ داری کو میں نے قبول کر لیا ہے۔ مجھے اس کے آرام کا خیال کرنا چاہیے۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھا کہ پربھا سے کچھ باتیں کرے لیکن اس کا دل بھر آیا۔ وہ پھر صوفے پر بیٹھ گیا اُسے اپنی زندگی کے سارے واقعات ایک ایک کر کے یاد آنے لگے کالج میں داخل ہونا۔ کالج جاتے ہوئے راستے میں کوشلیا کا مکان۔ اسکے بھائی سے دوستی پھر آنا جانا۔ باتیں ـــــ اور بہت سی باتیں محبت کا اقرار اور شادی کا وعدہ ـــــ اب وہ پھر کلکتہ واپس جانے والا تھا مگر کس منہ سے جا کر کوشلیا سے باتیں کریگا۔ وہ کیا کہیگی۔ آخر اس سے وعدہ کرنے کی کیا ضرورت تھی ـــــ کہے گی کہ جب تک یہاں تھے

میرے جذبات سے کھیلتے رہے اور جیسے ہی دولتمند گھر ملا۔ بیاہ کر لیا۔ اسے یہ کس منہ سے کہہ سکوں گا کہ ماتا پتا نے زبان دے دی تھی اور ان کی عزت کے خیال سے میں نے اپنی ساری آرزوؤں کا خون کر لیا۔ اگر کہوں بھی تو اس کو کیوں کر یقین آئے گا۔

سریندر دیر تک اسی قسم کی باتیں سوچتا رہا اور پربھا اپنی جگہ سمٹی سمٹائی بیٹھی رہی۔ وہ چاہتا تھا کہ پربھا کے ساتھ محبت کا نہیں تو کم سے کم ہمدردی کا برتاؤ ضرور کرے۔ ایک لڑکی کی زندگی کو برباد ہونے سے بچالے جس کا سہارا بیاہ کے بعد پتی کے سوا اور کوئی نہیں۔ وہ یہ بھی سوچنے لگا۔ کہ اس سے بناوٹی محبت ظاہر کرتا رہے۔ اپنے دل پر چاہے جو بھی گزرے مگر پربھا کو معلوم نہ ہو۔ اگر اُسے معلوم ہو گیا کہ مجھے کسی دوسری لڑکی سے محبت ہے تو اس کا دل ٹوٹ جائیگا — یکین ہے تو ضرور — مگر بلا سے جو کچھ دل پر بیتے گی محسوس کروں گا۔ خود گھلتا رہوں گا — لیکن پربھا کو اس کی خبر بھی نہ ہو گی —

یکایک پھر اُسے کوشلیا یاد آئی — اسکا دل بھر آیا۔ یہ تو صحیح ہے کہ پربھا کو میرے دل کی خبر نہ ہو گی۔ لیکن کوشلیا کو بیاہ کی خبر تو ہو ہی جائیگی۔ اگر میں اس کے سامنے نہ بھی گیا تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ میں کچھ کہہ نہ سکوں گا۔ لیکن اُس کے دل پر کیا گزرے گی — اُس کا دل ٹوٹ جائیگا۔ وہ زندہ بھی رہ سکے گی یا نہیں جس وقت اس کو میرے بیاہ کی خبر ہو جائیگی وہ سر پیٹ لیگی یا روتے روتے جان دیدے گی — اُف ماتا پتا نے دولت کی خاطر دو زندگیوں کو تباہ کر دیا —

اُس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

— سریندر اپنے خیالوں میں الجھا ہوا تھا کہ اُسکی چھوٹی بہن شانتی آگئی اور پربھا کو دیکھتے ہی بولی

"بھابی! آپ نے اب تک کپڑے نہیں بدلے!"

پربھا اپنی جگہ پر ہلی تک نہیں۔ بالکل چپ بیٹھی رہی۔ شانتی نے بھائی کو نہیں دیکھا اور پربھا کو گدگدانا شروع کر دیا۔ سریندر نے دیکھا کہ پربھا عجیب بے بسی میں ہے۔ تو بولا۔

"سانو!"

شانتی نے پلٹ کر بھائی کو دیکھا اور کھسیانی سی ہو گئی۔ بولی۔

"جی بھیّا آج ہم لوگ سینما جا رہے ہیں!"

"ایک گلاس پانی لیتی آؤ۔"

شانتی کو بھی اچھا موقعہ مل گیا۔ وہ کمرے سے باہر چلی گئی اور تھوڑی دیر میں پانی لیکر آگئی۔ سریندر نے پانی پیا اور بولا۔

"ہاں ٹھیک ہے ضرور جاؤ سینما۔"

گھر کے سارے لوگ سینما چلے گئے۔ سریندر رہ گیا۔ شام ہونے کو آئی لیکن وہ صوفے پر پڑا سوچتا ہی رہا۔ طرح طرح کے خیالات اسکے دماغ میں آتے رہے۔ کبھی کبھی اپنے خیالوں سے وہ خود ہی ڈر جاتا۔ جیسے کوئی شخص ڈراؤنے خواب دیکھ کر ڈر جاتا ــــــ تھوڑی دیر تک تو اس پر عجیب کیفیت طاری رہی۔ اس کا دل بے اختیار چاہتا تھا۔ کہ خودکشی کرے لیکن کوشلیا سے پھر ملنے کی تمنا اور امید نے اسے اس خطرناک ارادے سے روکا۔ اس کا دل چاہا کہ فوراً اٹھے اور شہر چلا جائے۔ وہاں کوشلیا سے مل کر سارا حال بیان کر دے کہیں ایسا نہ ہو کہ میری خودکشی کی خبر سُنکر کوشلیا بھی جان دے دے میری زندگی کے ساتھ دو اور زندگیاں جائیں گی۔ کوشلیا تو یقینی طور پر جان دے دیگی۔ اور پربھا بھی "ادھ مرد" ہو کر رہ جائیگی۔ اس لئے یہ غلط ہے

اب جس طرح بھی ہو ایسی راہ نکالنی چاہئے جس سے سب زندہ رہ سکیں۔

اُسے ایک ترکیب سوجھی۔ اُس نے سوچا کہ رات کے وقت پربھا سے سب کچھ کہدے گا" اسے صاف صاف کہوں گا کہ مجھے تم سے محبت نہیں اور نہ ہو سکتی ہے لیکن سماج کے قانون کے مطابق میں تمہارا ہو چکا ہوں اس لئے تمہارے ہر آرام کا خیال اور انتظام کرتا رہوں گا لیکن تم اس بات کی اجازت دیدو کہ میں کوشلیا سے شادی کر لوں " اس کے دل کو اس خیال سے بڑا سکون ہوا۔ اسے یقین ہو گیا کہ پربھا اسے اجازت دیدیگی ـــــ اور کوشلیا بھی شادی کر لیگی ـــــ لیکن کوشلیا کے ماں باپ اُسے کیونکر پسند کریں گے ؟

اسکے دل کو ایک دھکا لگا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اب نہ وہ کوشلیا کا ہو سکتا تھا اور نہ کوشلیا اسکی ہو سکتی تھی۔ دونوں ہمیشہ کے لئے ایکدوسرے سے الگ ہو چکے تھے ـــــ مگر پھر بھی پربھا سے ساری باتیں کہدینا ضروری ہے۔

کمرے میں تاریکی چھا چکی تھی۔ نوکر لیمپ جلا کر رکھنے آیا تو سریندر یکایک چونکا۔ اس نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی سنگار میز پر پربھا کی تصویر رکھی ہوئی تھی۔ اب تک اُس نے پربھا کو پوری طرح دیکھا بھی نہیں تھا۔ پربھا واقعی خوبصورت لڑکی تھی ـــــ سریندر کے دل کو پھر ایک دھکا لگا۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ کاش اس غریب کا بیاہ کسی دوسرے آدمی سے ہوتا تو وہ اس کے حسن کی قدر کرتا اس سے محبت کرتا لیکن بدنصیبی سے وہ ایسے آدمی سے بیاہ دی گئی ہے جس کے پاس اب محبت دوسرے کو دینے کیلئے نہیں رہی ـــــ وہ دیر تک پربھا کی تصویر کو دیکھتا رہا۔ اور افسوس کرتا رہا۔

سریندر کا دماغ جب سوچتے سوچتے تھکنے لگا۔ تو اس نے ایک کتاب اُٹھالی اور اسے پڑھنا

شروع کیا، پھر کتاب لئے ہوئے مسہری پر لیٹ گیا ——— کتاب تاریخ کی تھی، یہی اسکا پسندیدہ موضوع تھا۔ وہ کتاب پڑھنے میں سب کچھ بھول گیا۔ دیر تک اسے پڑھتا رہا۔ وہ کتاب دیکھنے میں غرق تھا۔ کہ یکایک چونک پڑا۔ پربھا اور شانتی ہنستی ہنستی ہوئی کمرے میں آ گئی تھیں۔ اس نے دیکھا، پربھا ہنستی ہوئی اسے اور خوبصورت معلوم ہوئی۔ وہ دیکھتا رہا۔ یکایک پربھا کی نظر بھی اس پر پڑ گئی۔ نظر پڑتے ہی پربھا شرما گئی۔ اس کے شرما جانے کی ادا سریندر کو اور بھلی معلوم ہوئی۔ شانتی نے بھائی کو دیکھا۔ تو شرمندہ ہو کر بھاگ گئی۔

پربھا شرمائی ہوئی کھڑی رہی اور سریندر اسے دیکھتا رہا۔ یکایک سریندر کو خیال آیا۔ اس نے کہا۔

"آؤ بیٹھ جاؤ ——— "

پربھا لجاتی ہوئی آئی اور مسہری کے پاس کرسی پر بیٹھ گئی۔ سریندر نے چاروں طرف کمرے میں دیکھا۔ دروازوں پر پردے پڑے ہوئے تھے اور آس پاس کسی کی آہٹ بھی نہ تھی۔ اس نے پھر کہا۔

"آؤ، یہاں بیٹھو!"

پربھا کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس سے پہلے سریندر نے اس سے کوئی بات نہ کی تھی۔ اس نے سوچا۔ یہ وقت موزوں ہے۔ پربھا سے ساری باتیں صاف طور پر کہدینی چاہئیں ——— لیکن ہاں، اس طرح کہ پربھا کو کوئی صدمہ نہ پہنچے۔

وہ مسہری سے اٹھ کر پربھا کو اٹھا کر لائے۔ اچانک اسے خیال آ گیا۔ کہ دروازے کھلے ہیں صرف پردے پڑے ہیں۔ اس نے اٹھ کر دروازوں کو دیکھا اور آہستہ آہستہ بند کر دیا۔ پھر مسہری پر بیٹھ گیا اور بولا۔

"سنو ــــــ تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

لیکن پربھا اب بھی اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ سریندر اُٹھا۔ پربھا کے پاس آیا۔ اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھانے لگا لیکن پربھا لجاتی شرماتی اپنا بدن سمیٹتی گئی۔ آخر اُس نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اُسے اُٹھایا معلوم ہوا، جیسے سریندر کو بجلی چھو گئی۔ سارے بدن میں سنسنی پھیل گئی۔ پربھا سمٹی سمٹائی مسہری پر بیٹھ گئی۔ سریندر اس کے پاس ہی بیٹھ گیا اور آہستہ سے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔

"سنو ــــــ!"

اُس نے چاہا تھا کہ سب کچھ کہہ دے لیکن پربھا نے جیسے ہی ہلکی ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ شرماتی ہوئی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا، سریندر سب کچھ بھول گیا۔ کچھ نہ کہہ سکا۔ پربھا اُسے دیکھتی ہی رہی۔ سریندر نے اپنی حالت کا اندازہ کیا اور پھر سنبھل کر بولا ــــــ "سنو پربھا!"

پربھا نے مسکرا دیا۔ سریندر کھسیانا سا ہو گیا۔ اور پربھا کا منہ تکنے لگا۔ پربھا نے شرماتے ہوئے کہا ــــــ "کہئے!"

سریندر سے کچھ نہ کہا جا سکا۔ البتہ اس کا ہاتھ خود ہی پربھا کے شانے سے سرک کر اس کے پہلو تک پہنچ گیا۔ سریندر کے سارے بدن میں چنگاریاں سی چھوٹنے لگیں۔ وہ غور سے پربھا کی شکل دیکھنے لگا۔ اور پربھا سے قریب ہوتا گیا۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا ــــــ کبھی کبھی اسے حلق سوکھتا ہوا معلوم ہوتا مگر اس کے دل میں اور کچھ نہ تھا۔ آخر اُس نے پربھا کو اپنی طرف ذرا زور سے کھینچا۔ وہ سمٹتی ہوئی بالکل اُس کی گود میں آتی رہی ــــــ اُس نے پربھا کا سر اپنے زانو پر رکھا۔ اور ذرا کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

"پربھا ——"

پربھا لجاتی ہوئی آنکھیں بند کئے اس کے زانو پر سر رکھے پڑی تھی۔ اُس نے کوئی جواب نہ دیا لیکن سریندر نے آپ ہی آپ کہا۔

"میں نے تمہیں آٹھ دن تک مفت میں ستایا۔ تم بہت خوبصورت ہو۔"

پربھا نے اپنا چہرہ سریندر کی گود میں چھپا لیا —— سریندر پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ آہستہ آہستہ اُس کے چہرے پر جھکنے لگا —— اسی وقت کمرے سے باہر شانتی نے آواز دی۔

"بھابی کھانا کھانے چلئے نا!"

سریندر نے جواب دیا۔

"وہ ابھی آئیں گی شانتو۔" ✤

پیٹ کی آگ

برسات کا موسم ختم ہو چکا تھا اور دھیرے دھیرے سردی اپنا پر اجما رہی تھی جب تیز ہوا چلتی تھی تو ٹھنڈ بجلی کی لہروں کی طرح بدن میں دوڑ جاتی تھی۔

بھیانک اور کالی رات آدھی سے زیادہ جا چکی تھی۔ سارے شہر پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بازاری کتے اِدھر اُدھر مارے مارے پھر رہے تھے۔ یا پولس کے سپاہی اپنی ڈیوٹی کے مطابق گھوم گھوم کر پہرہ دے رہے تھے۔ اور آسمان سے چمکیلے تارے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دنیا پر موت کے اس چھائے ہوئے سناٹے کو دیکھ رہے تھے۔

غریب رحیم دن بھر کا تھکا ہارا اور بھوکا تھا۔ رات اتنی جا چکی تھی مگر وہ ابھی بجلی کے ایک کھمبے سے لگا کھڑا تھا۔ کچھ سوچ رہا تھا۔ اُس کے بدن پہ پھٹے اور میلے کپڑے تھے جن کو چھیدتی ہوئی

ٹھنڈی ہوا اُس کے بدن میں گھس رہی تھی۔ شبنم کی دھیمی دھیمی پھوار پڑ رہی تھی، اور اُس کے کمزور بدن کو ٹھنڈا کر رہی تھی۔

ٹھنڈی ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ اور رحیم کانپ گیا۔ اُس نے بدن کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور ہلایا پھر اوپر بجلی کی روشنی کو دیکھا۔ شبنم گرنے کی وجہ سے اُس سے مدھم روشنی پھوٹ پھوٹ کر پھیل رہی تھی بدن ہلا تو بھوک نے پھر کروٹ لی۔ پیٹ میں آگ لگ گئی۔ وہ بے چین ہو گیا۔ مگر جلد ہی سردی نے اُس کے خیال کو بھوک کی طرف سے ہٹا کر اپنی طرف پھیر لیا۔ رحیم نے للچائی نظروں سے اُن بڑے بڑے مکانوں کو دیکھا جو سڑک کے دونوں طرف ایک قطار سے کھڑے تھے۔ اُس کے دل سے ایک چپ آہ اُٹھی۔ اور بیکسی کے ساتھ اُس کے دل ہی میں ڈوب کر رہ گئی۔ پھر اُس نے دور ایک چھوٹے سے مکان کو بھی دیکھا اور سوچنے لگا کہ وہیں جا کر آرام کرے۔ مگر ایک بات اُس کو یاد آ گئی۔ دس بجے کے لگ بھگ ایک بار وہ اس مکان میں جا چکا تھا۔ لیکن مکان کے مالک نے اسکو وہاں ٹھہرنے نہیں دیا تھا۔ اور بہت خوشامد کرنے پر بھی اُس نے پروا نہ کی تھی۔

بیچارہ رحیم بھوک اور ٹھنڈک کو دلاسا دینے کے لئے بدن چرا کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا۔ آخر کیا ہو گا؟ لیکن کچھ نہ سوچ سکا۔ غریب بیوی کی یاد نے اُس کو بے چین کر دیا۔ جس نے چلتے وقت بار بار کہا تھا کہ جیسے بھی ہو کچھ روپیہ ضرور بھیجدینا۔ اُس کی مرجھائی ہوئی جوانی اور پھیکا چہرہ، سوکھے ہوئے بدن اور پھٹے ہوئے کپڑوں کی یاد آئی اور وہ کسمسا کر رہ گیا۔ پھر سوچنے لگا۔ وہ اتنے بڑے شہر میں ایک ہفتہ سے آیا ہوا تھا لیکن کچھ نہ کر سکا۔ گھر بھیجنا تو ایک طرف اپنے کھانے پینے کا سامان بھی نہ کر سکا۔ ایک ہفتہ اور چھ آنہ مزدوری جیب سے کبھی چنے اور کبھی ستو خرید کر اپنے پیٹ کی آگ بجھاتا رہا۔

جس وقت وہ شہر میں آیا تھا اُس کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے۔ اُس کو یقین تھا کہ کچھ ہی دنوں میں اتنا کمائے گا کہ خود کھانے کے علاوہ کچھ گھر بھی بھیج سکے گا۔ لیکن ہوا کیا؟۔ سارے دن شہر کی خاک چھانتا رہا، نہ کوئی نوکری ملی، نہ ایک پیسہ کی مزدوری۔

دوسرے دن ایک آنہ ملا۔ آدھا من بوجھ ایک بابو صاحب کے گھر پہنچانے کے لئے۔ بھوکا تھا۔ ایک آنہ کا ستو کھا گیا۔ تیسرے دن دو آنے ملے۔ اُس کا دل بڑھ گیا۔ ایک آنہ خود کھایا اور ایک آنہ بچا لیا۔ لیکن چوتھے دن بھر کوئی کام نہ ملا۔

اسی طرح وقت کٹتا رہا۔ جب مزدوری کی طرف سے آس ٹوٹ جاتی تو نوکری ڈھونڈنے لگتا اور جب نوکری کی طرف سے نا اُمید ہو جاتا تو بازار میں آ کر مزدوری کا کوئی کام دیکھتا۔ لیکن اُس کی ساری کوششیں بے کار ہوئیں۔

وہ نوکری کے لئے ایک بابو صاحب کے یہاں گیا اور چپ کھڑا رہا۔ ڈر سے زبان نہ کھلی۔ بابو نے خود ہی کہا۔

"ہٹا کٹا ہو کر نوکری کیوں نہیں کرتا۔ بھیک مانگتے شرم نہیں آتی؟"

اس نے دبی زبان سے جواب دیا:۔

"حضور میں بھیک نہیں، نوکری چاہتا ہوں۔"

بابو نے کرسی پر کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

"تجھے نوکری کون دے گا۔ نہ جانے چور ہے کہ ڈاکو۔ جا کسی دوسری جگہ۔ میرے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔"

وہاں سے وہ واپس آیا۔ دوسرے اور تیسرے دروازے پر گیا، لیکن اُسے نوکری نہ ملی گھبرا کر پھلوں اور ترکاریوں کے بازار میں آیا۔ ایک بابو نے اکڑ کر پوچھا۔

"ارے تم مزدور ہو؟"

رحیم نے بڑی امید کے ساتھ جواب دیا۔

"جی ہاں سرکار۔"

بابو صاحب بولے۔

"تیری ٹوکری کہاں ہے؟"

اس نے جواب دیا

"سرکار میرے پاس ٹوکری نہیں ہے۔"

بابو صاحب نے منہ سے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔

"تو میرا کام تجھ سے نہیں چلے گا۔ میرے پاس سامان زیادہ ہے۔

اُس نے کہا۔

"میں اپنی چادر میں باندھ کر سامان پہنچا دوں گا۔"

مگر بابو صاحب نے ایک دوسرے مزدور کو آواز دی

یہ آگے بڑھ کر کچھ کہنا چاہتا تھا کہ آنے والے مزدور نے اس کو گالی دی اور دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا اور ساری ترکاریاں اپنی ٹوکری میں اٹھا کر چلتا بنا۔ یہ منہ دیکھتا رہ گیا۔

رحیم ساری باتوں کو سوچ رہا تھا اتنے میں ایک سپاہی آیا۔ اُس نے دیکھا اور رحیم کے

سر پر ایک چپت مار کر بولا۔

"ابے ۔ ۔ ۔ ۔ یہاں کیا کر رہا ہے۔ چوری کرنے کا ارادہ تو نہیں ؟"

رحیم نے سر اٹھا کر دیکھا اور لال پگڑی کو دیکھ کر کانپ گیا۔ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

"نہیں حضور میں بہت غریب آدمی ہوں"۔

"تو پھر یہاں کیوں بیٹھا ہے بے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"حضور میرا کوئی گھر ہی نہیں ہے جہاں رہوں"۔

سپاہی نیک آدمی تھا۔ دو چار گالیاں دیکر اپنی راہ چلا گیا۔ وہ پھر ساری باتیں سوچنے لگا پھر اس کو خیال ہوا کہ اگر صبح کے وقت کوئی کام نہ ملا تو کیا ہو گا۔

اسی ادھیڑ بن میں رات ختم ہو گئی۔ اور گھنٹہ گھر سے چار بجنے کی آواز آئی۔ ستاروں کی روشنی پھیکی پڑنے لگی۔ رحیم ایک لمبی جمائی لیکر کھڑا ہو گیا اور اسٹیشن کی طرف چلا کہ شائد وہاں کوئی مزدوری مل جائے۔

وہ اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا۔ مگر بھوک سے اُس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ سٹیشن کی طرف سے کچھ سواریاں آتی دکھائی دیں۔ اسکی ہمت اور امید بڑھ گئی۔ وہ تیزی سے قدم اٹھانے لگا دو چار گاڑیاں اُس کے پاس سے ہوتی ہوئی نکل گئیں اور سڑک پر سناٹا ہو گیا۔ اسٹیشن اب بھی دور تھا۔ گاڑی آنی بند ہو گئیں تو اس کی ہمت اور امید ٹوٹ گئی۔ اُس کو یقین تھا کہ مسافر چلے گئے ہونگے۔ لیکن اُس کے پاؤں بڑھتے ہی گئے۔

تھوڑی دور گیا تھا کہ ایک عورت دکھائی دی۔ اُس کے پاس کافی سامان تھا، اور وہ

اس کو مشکل سے اٹھائے چلی آرہی تھی، ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بکس تھا۔ رحیم اُس کے پاس گیا اور بولا۔

"لاؤ ماں میں پہنچا دوں جو جی میں آئے دے دینا۔"

یہ کہکر اُس نے بکس کی طرف ہاتھ بڑھایا، عورت نے جھٹکے کے ساتھ بکس کو کھینچ لیا اور بگڑ کر بولی۔

"الگ رہ۔"

بکس سے چھن سے آواز آئی رحیم کے دل میں بہت سی باتیں تیزی کے ساتھ آئیں اور نکل گئیں، دل نے پلک مارتے ہی بہت سی کروٹیں لے لیں۔ اس کا ہاتھ پھر بکس پر مضبوطی کے ساتھ پڑا، عورت کے ہاتھ سے چھوٹ کر اسکے ہاتھ میں آرہا، عورت کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی ——

"چو . . . . ."

لیکن رحیم کا دوسرا ہاتھ عورت کے منہ پر پڑا —— پھر حلق —— اُس نے عورت کو زور سے دھکا دیا، وہ دور جا گری، سارا سامان اِدھر اُدھر تتر بتر ہو گیا —— عورت سڑک پر تڑپ رہی تھی، اور رحیم آہستہ آہستہ چھپتے ہوئے اندھیرے میں تیزی کے ساتھ نظر سے اوجھل ہوتا جا رہا تھا ——

چار آنے

باپ کچہری چلا گیا تو ریاض نے اطمینان کی سانس لی جیب میں ہاتھ دیکر چونی ٹٹولی اور
مطمئن ہو گیا۔ وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں بھانڈا نہ پھوٹ جائے کہیں اُس کی ماں خرچ کے لئے پیسے
نہ مانگ بیٹھے۔ باپ اپنی جیب میں ہاتھ ڈالے اور چونی غائب پائے۔ مگر اُسے یہ سوچ کر تھوڑی
دیر کیلئے اطمینان ہو جاتا کہ باپ کی جیب میں پیسے کافی تھے۔ دوسرے یہ کہ سارے پیسے رشوت کے
ہیں۔ پھر بازار سے خریداری کرتے آئے تھے۔ کہاں یاد رہوگا۔ وہ اپنے باپ کی عادت کو جانتا تھا
وہ کبھی بھولے سے بھی پیسوں کا حساب نہ رکھتا تھا۔ مگر پھر بھی اُس کا دل خیال ہی سے دھک دھک
کرنے لگتا کہ کہیں چوری کھل نہ جائے۔ آخری سہارا بس ایک تھا اور وہ یہ کہ اگر کہیں اُ کسی طرح
چونی کے غائب ہونے کا پتہ چل گیا تو وہ صاف کہدیگا کہ معلوم نہیں اور چونکہ کبھی چوری کا الزام

اُس پر نہیں لگا۔ اِس لئے باپ آسانی کے ساتھ یہ سمجھ لیگا کہ چونّی کسی طرح کھو گئی، اور اسے اپنی بے پروائی پر افسوس آئیگا۔ مگر پھر بھی یہ خیال کہ کہیں پتہ چل گیا، تو . . . . خیر نہیں ——

لیکن یہ نوبت ہی نہ آئی۔ اُسکے باپ نے کچہری جاتے وقت اُس کی ماں کو روپے دیئے ایک ایک پیسہ جیب سے نکالکر گِنا۔ اُس نے چونّی غائب ہونے کی شکایت نہ کی۔ ریاض کا سارا ڈر مٹ گیا۔ اُس نے سوچا کہ آج خوب مزا آئیگا۔ اسکول میں بڑھیا سے چنیا بادام اور حلوائی سے مٹھائی لے کر کھائیگا۔ دوسرے لڑکے اُسکو رشک کی نظر سے دیکھیں گے جیسے اور روز وہ دوسروں کو دیکھتا ہے۔

اُس نے جلدی جلدی اپنی کتابیں درست کیں اور دروازے سے باہر نکل کر گلی میں آیا۔ بغل میں کتابوں کا بستہ تھا اور ایک ہاتھ جیب میں۔ وہ برابر چونّی کو دیکھتا اور سوچتا جا رہا تھا کہ اُسے کس طرح خرچ کریگا، کون کون سی چیزیں کھائیگا اور اِس دعوت میں کن کن دوستوں کو شریک کریگا اب اُسے پکڑے جانیکا ذرا بھی ڈر نہ تھا۔ وہ اپنے خیالات میں اُلجھا ہوا گلی سے باہر سڑک پر آیا۔ بازار میں زندگی پوری طرح دوڑ رہی تھی۔ اُس نے چاروں طرف نظر گھما کر دیکھا اور سوچنے لگا کہ کونسی چیز خریدی جائے۔ پاس ہی فٹ بال کی ایک دوکان تھی اُس نے ایک فٹ بال کو دیکھا اور دل ہی دل میں افسوس کرنے لگا۔ اگر دو روپے باپ کی جیب سے نکال لیتا تو وہ فٹ بال خرید سکتا مگر۔۔

اُس نے دل ہی دل میں سوچا ٹھیک ہے۔ لٹّو کا ایک سٹ خریدا جا سکتا ہے، چار ہی آنے کو ملتا بھی ہے۔ خرید کر اسکول لیجاؤں۔ وہاں سارے دوست، ساتھی میری خوشامد کرینگے کہ میں اُنھیں کھیل میں شریک کر لوں۔ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ لٹّو خریدنا چاہیئے وہ دوکان کی طرف بڑھا مگر۔۔ مگر پھر جیب گھر واپس آؤں گا تو کہاں رکھوں گا۔ ماں پوچھے گی۔ باپ کہے گا کہاں سے لائے؟

تو کیا جواب دوں گا۔

اُسکا خیال بدل گیا۔ لڈو خریدنا کسی طرح مناسب نہ تھا پھر اُسکا دماغ بالکل خالی تھا اور وہ چاروں طرف بانادیں نظریں گھما گھما کر دیکھ رہا تھا۔ یکایک اُسکا ایک ساتھی نصیر آتا ہوا نظر پڑا نصیر ابھی دور ہی تھا ریاض نے اُسکو آوازدے کر بلایا۔

نصیر آیا۔ دونوں ساتھی اسکول کی طرف بڑھے۔ نصیر نے پوچھا۔

"اِدھر اُدھر تم کیا دیکھ رہے تھے"؟

ریاض کی نظر یکایک پان والے کی دوکان پر گئی۔ وہ دوکان بڑے سلیقے سے سجی ہوئی تھی۔ پان وغیرہ کے علاوہ بہت سی بوتلوں میں رنگ برنگ کا پانی بھرا رکھا تھا۔ پھر شربت، سوڈا، لیمونڈ کی بوتلیں۔ ریاض کے دماغ میں ایک بات یکایک آگئی لیمونڈ پینا چاہیے۔ اُسنے نصیر کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا

"یار بڑی پیاس معلوم ہو رہی ہے لیمونڈ پینا چاہیے" ——

نصیر نے جلدی سے کہا

"ہاں یار، ہم کو بھی پلاؤ گے نا"؟

ریاض نے فوراً شاہانہ انداز میں کہا

"واہ یہ بھی کہنے کی بات ہے"؟

دونوں پان والے کی دوکان پر پہنچے اب سوال یہ تھا کہ لیمونڈ کی ایک بوتل خریدی جائے یا دو۔ ایک بوتل میں کیا ہوگا کون پیئے گا اور کون نہیں، ریاض سوچنے لگا لیکن نصیر کو ایک بوتل پلا دیں۔ اُس نے تو کبھی کوئی چیز خرید کر نہیں کھلائی۔ بڑا بخیل ہے مگر بیچارے کے پاس پیسے ہی نہ ہونگے کہاں سے کھلاتے بیچارہ۔

ریاض نے پان والے سے کہا ۔ "دو بوتل لیمونڈ دو ۔"
پھر وہ نصیر کی طرف مخاطب ہوا اور بولا ۔

"یار نصیر! بڑی پیاس معلوم ہو رہی ہے، تم اپنی بوتل میں سے بھی تھوڑا سا ہمیں دیدینا۔"
نصیر نے بڑی خوشی کے ساتھ کہا ۔ "ہاں یار ضرور۔"

پان والے نے بوتلیں کھولکر دیں۔ ایک بوتل ریاض نے اپنے منہ سے لگائی، دوسری نصیر کو دی۔ ساتھ آہستہ کہدیا۔

"سب مت پی جانا یار!"

ریاض نے جلدی جلدی پانی پینا شروع کیا۔ ایسا نہ ہو کہ نصیر ساری بوتل ختم کر دے نصیر نے بھی یہی سوچا جتنا زیادہ پینے کا موقع ملے پی لے۔ ریاض برابر تیزی کے ساتھ پیتا گیا۔ لیکن نصیر نے آدھی بوتل ختم کر کے آہستہ آہستہ پینا شروع کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ پی لے مگر پھر بھی کچھ چھوڑ دے گا ورنہ ریاض خفا ہو جائیگا۔ پھر کبھی کوئی چیز نہ کھلائیگا۔ ریاض نے جب اپنی بوتل خالی کر دی تھی نصیر نے با دل نخواستہ بوتل ریاض کی طرف بڑھا دی۔ بوتل میں ایک چوتھائی پانی موجود تھا لیکن ریاض نے بوتل لیتے ہوئے کہا

"سب پی گئے نا یار!"

"کہاں تو، آدھا بھی تو نہیں پیا ——"

ریاض نے زیادہ بحث نہیں کی۔ بوتل میں جتنا لیمونڈ بچ رہا تھا اُسے پی گیا۔ اِسکے بعد بوتل پان والے کو دیدی اور جیب سے چونی نکال کر دی۔ پان والے نے دوآنی واپس کر دی۔ ریاض نے دوآنی لیکر پھر اُسے واپس کر دی اور بولا :- "ہمیں پیسے دیدو ——"

پان والے نے دو آنے پیسے دیدیئے۔ ریاض نے پیسے جیب میں رکھے۔ دونوں ساتھ ساتھ اسکول کی طرف چلے۔ ریاض راستہ میں ہر چیز کو ایک خاص نظر سے دیکھتا جارہا تھا۔ اگر اُسکا بس چلتا تو سارے بازار کو خرید لیتا۔ لیکن یہ بات اُسکے بس سے باہر تھی۔ ایک تو پیسے کم دوسرے چوری کھلنے کا ڈر۔ بلکہ چوری کھلنے کا ڈر اُسے اتنا زیادہ تھا کہ دو آنے میں سارا بازار مل جاتا، تو بھی وہ نہ خریدتا۔

ریاض جب اسکول پہنچا تو دیر ہو چکی تھی۔ مار کھانا ضروری تھا۔ ریاض اور نصیر دونوں اسکول کے پیچھے ایک درخت کے نیچے کھڑے ہو کر سوچنے لگے۔ کیا کرنا چاہئے۔ بہت دیر تک سوچنے کے بعد فیصلہ ہوا کہ آج اسکول سے غیر حاضر، دو تین گھنٹے کی بات ہے سنیچر کا دن ہے سویرے ہی چھٹی ہو جائیگی۔ گھر چلے جائینگے۔ پیر کے دن ایک درخواست لیتے آئینگے اس پر باپ کے جعلی دستخط بنائیں گے۔ دونوں کا اطمینان ہو گیا۔ وہ دونوں پھر اسکول کے احاطے سے نکلے اور بازار کی طرف چلے۔

بازار میں پوری رونق تھی۔ ریاض کی نگاہیں ہر طرف بھٹکنے لگیں۔ اُسکا دل بڑھا ہوا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ پسند کی کوئی چیز نظر آئے۔ اُسکی جیب میں دو آنے پیسے تھے وہ سارے بازار میں اپنے کو کسی سے کم کسی حالت میں بھی نہ سمجھتا تھا۔ ہر چیز کو خرید لینے کیلئے اُسکا دل چاہتا تھا مگر دو مجبوریاں تھیں، ایک تو یہ کہ پیسے کم تھے۔ دوسرے کوئی ایسی چیز خریدنے پر کسی حال میں بھی آمادہ نہ تھا جسکو دیکھتے ہی اسکے ماں باپ سوال کر بیٹھیں کہ یہ کہاں سے لے آئے۔

وہ بازار میں چلتا گیا۔ نصیر اُس کے ساتھ تھا بغل میں کتابوں کا بستہ تھا اور دوکانوں پر نگاہیں، ہر چیز کو وہ ایسی نظر سے دیکھتا جارہا تھا جیسے ہر چیز کے متعلق اپنی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا فیصلہ کر چکا تھا۔ لیکن پاؤں کہیں نہیں رکتا تھا۔ اُس کے پاؤں تھکنے لگے تو وہ ایک بڑی دوکان کے پاس رک گیا۔ ایک اطمینان کی سانس لی اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

یکایک اُسے پکوڑیوں والا نظر آیا۔ معلوم ہوا جیسے ریاض کو وہ چیز مل گئی جس کی اُسے بہت دیر سے تلاش تھی نصیر کا اُس نے ہاتھ پکڑا اور تیزی کے ساتھ اُس طرف بڑھا۔ نصیر اُس کے ساتھ کھینچتا چلا۔ دونوں پکوڑی والے کے چبوترے کے پاس پہنچ گئے۔ ریاض نے ایک خاص انداز سے پوچھا۔

"کیوں جی پکوڑیاں تازہ ہیں نا؟"

"ہاں بابو جی ——"

بوڑھے پکوڑی والے نے جواب دیا۔ ریاض نے شان کے ساتھ کہا۔

"دو ایک ایک پیسے کی"

بوڑھے نے دونوں کو ایک ایک پیسہ کی پکوڑی دی۔ دونوں نے کھالی، ریاض کا دل نہ بھرا۔ اُس نے کہا۔

"ایک پیسے کی اور دو ——"

بوڑھے نے دی نصیر اُس کا منہ دیکھنے لگا۔ اُس کی نگاہوں میں شکایت تھی۔ اُس نے کہا۔

"کیوں یار اکیلے ہی کھاؤ گے؟"

ریاض نے کہا۔

"نہیں یار ——"

اور پانچ پکوڑیوں میں سے دو نصیر کو دیدیں۔ دونوں نے کھائیں مگر دل کسی کا نہ بھرا۔ ریاض نے ایک پیسے کی پکوڑی اور بھی خریدی۔ وہ بھی نصیر کو دیں۔ اُس نے شکایت کی۔

"یار ہم کو کم دیتے ہو ——"

"پیسہ جو ہم خرچ کرتے ہیں۔"

ریاض نے شانِ شان کے ساتھ کہا۔ نصیر چپ ہو گیا لیکن ریاض کو نصیر کا اعتراض برا معلوم ہوا۔ اُس نے دل میں سوچا کہ حد درجہ ناشکرا آدمی ہے کھلاتا ہوں اُلٹی شکایت کرتا ہے خود کبھی کچھ کھلاتا نہیں۔ اُس کا دل تھا کہ اور بھی کچھ کھلائے مگر وہ آگے بڑھا۔

اب اُس کی جیب میں چار پیسے رہ گئے تھے مگر گھر پہنچنے سے پہلے وہ سب کو خرچ کر دینا چاہتا تھا۔ ایسا نہ ہو کہ جیب میں پیسوں کی آواز ہو اور ماں باپ کوئی پوچھ بیٹھے وہ اور آگے بڑھا اُس کا گھر بھی نزدیک آتا جا رہا تھا وہ سخت پریشان تھا کہ اِن پیسوں کو کس طرح خرچ کیا جائے

یکایک اُس کے دماغ میں بات آئی۔ پان کھانا چاہئے۔

دونوں پان کی دوکان پر پہنچے۔ وہاں پان بنانے کو بھی کہدیا۔ پان والا پان بنانے لگا تو خیال آیا کہ ماں منہ دیکھ کر پوچھے گی۔ پان کہاں کھایا۔ اُس نے نصیر سے اپنی رائے کہدی مگر نصیر کا دل چاہ رہا تھا اُس نے سمجھایا کہ پان حالانکہ مانیگا تو وہ گھر جانے سے پہلے کل پر منہ دھو لیگا لیکن ریاض کی رائے سگریٹ پینے کی ہوئی۔ آخر دونوں نے پان کھایا اور سگریٹ بھی خرید کر پینے لگے۔ انجن کی طرح بھک بھک دھواں منہ سے چھوڑتے آگے بڑھے۔

تھوڑی دیر میں سگریٹ ختم ہو گیا۔ اسکول کا وقت بھی پورا ہو گیا۔ ریاض کو جلد گھر پہنچنے کی فکر ہوئی۔ دیر ہوئی اور ماں نے سوالوں کی بوچھاڑ سے بدحواس کر دیا۔ وہ سگریٹ کا دھواں اُڑاتا ہوا سیدھا گھر کی طرف چلا کبھی وہ پوری شان کے ساتھ دھواں منہ سے چھوڑتا اور کبھی ڈر جاتا کہ کوئی بڑا بوڑھا دیکھ رہے

اگر کسی نے شکایت کر دی تو مار کھانا ضروری ہے۔

اِس طرح وہ اپنے مکان جانیوالی گلی کے قریب پہنچ گیا۔ یکایک اس نے سگریٹ کو پھینک دیا اب اُس کے گھر پہنچنے کا وقت ہو چکا تھا وہ تیزی سے بڑھا لیکن پان یاد آگیا وہ پانی کے نلکے پر کھڑا ہو کر منہ دھونے لگا۔ خوب اچھی طرح دھویا، اُس کو منہ دھونے کا بے حد افسوس ہو رہا تھا، مگر وہ منہ دھوتا رہا منہ دھو کر مٹھا اور گھر کی گلی کی طرف بڑھا نصیر نے منہ نہیں دھویا۔ شاید اُسے کوئی ڈر نہ تھا دونوں دوست الگ ہو گئے۔ ریاض گھر کی گلی میں گھسنا ہی چاہتا تھا کہ یکایک اُسے یاد آگیا۔ دو پیسے ابھی اور باقی ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ یہی بھانڈا پھوڑ دیں، وہ بہت گھبرایا، اِن پیسوں کو کس طرح خرچ کیا جائے۔ وقت بھی کم ہے نصیر بھی جا چکا نہیں تو اُسی کو دیدیتا۔ کہ رکھ دے۔ آس پاس میں کوئی چیز بک بھی نہیں رہی تھی۔ وہ چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا اُس کو بار بار خیال آتا تھا کہ انہیں بھی خرچ کیوں نہ کر دیا مگر اب کیا ہو!

وہ گلی کے سامنے کھڑا سوچ رہا تھا اور کوئی بات اُس کے دماغ میں نہیں آرہی تھی وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ وقت پر اُسے گھر پہنچ جانا چاہیے۔ یکایک ایک بڑھیا ڈنڈا ٹیکتی آتی دکھائی دی۔ ریاض کو جیسے کوئی کھوئی ہوئی بات یاد آگئی وہ تیزی کے ساتھ بڑھیا کے پاس پہنچا اور اُس کو جھنجھوڑ کر پوچھا۔ "بڑھیا پیسہ لے گی؟"

جیئے میرا بیٹا۔ . . . . اُس نے ہاتھ پھیلا دیا۔ بڑھیا دعائیں دینے لگی۔ لیکن ریاض نے سنا تک نہیں۔ اُس نے دونوں پیسے اُس کے ہاتھ میں رکھے اور اپنے گھر والی گلی میں گھس گیا۔

قیدی

کھڑکھڑ، جھن جھن ——— ہتھکڑی اور بیڑیوں کی زنجیریں بولیں۔

قیدی نے ایک لمبی جمائی لی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ چھوٹی سی کوٹھڑی جس میں وہ بند تھا۔ بالکل اندھیری تھی اُس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا۔ مگر وہاں قبر کا اندھیرا تھا کچھ نظر نہ آیا۔ اس کو نیند نہیں آرہی تھی بدن ٹوٹتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ زنجیروں میں جکڑا ہونے پر نیند کہاں سے آتی ——— اور اس سے زیادہ وہ خیالوں کی زنجیر میں جکڑا ہوا تھا۔ آس اور نراس میں لڑائی چھڑی ہوئی تھی تین مہینے سے وہ قید میں تھا۔ اب اس کا مقدمہ ختم ہو چکا تھا۔ جج فیصلہ سنانے کی تاریخ دے چکا تھا۔ کبھی آس کی دیوی آکر اپنی جھلک دکھا جاتی اس کو یقین ہو جاتا کہ وہ چھوٹ جائیگا۔ اپنے وکیل کی زوردار بحث کو یاد کرکے وہ خوش ہو جاتا اسکو بوڑھی

اندھی ماں، بیوی اور جوان بیٹی یاد آجاتی۔ اس خیال سے کہ جلد ہی رہائی پاکر اُن سے ملے گا۔ اس کے دل کا کنول کھلنے لگتا۔ ہونٹوں پر خوشی کی مسکراہٹ دوڑنے لگتی۔ جس کا دیکھنے والا وہاں کوئی نہ تھا ——— لیکن اُس کی یہ خوشی زیادہ دیر تک قائم نہ رہتی۔ نراسا کی دیوی کالی مائی کی مورتی سے زیادہ بھیانک روپ میں اُس کی نگاہوں کے سامنے آجاتی۔ پھر اس کو وہ وقت یاد آجاتا جب اُس نے بوڑھی سنارن کو قتل کیا تھا۔ اس کی ساری چیزیں لے کر بھاگ آیا تھا۔ اسکو یقین ہوجاتا کہ اُسے پھانسی کی سزا ضرور ہوگی۔ وہ سارے بدن سے کانپ جاتا۔ اُس کی ہولناک چیخ کانوں میں گونج اُٹھتی، جو بوڑھی عورت کے منہ سے نکلی۔ مگر حلق ہی میں ڈوب کر رہ گئی تھی اسوقت زیادہ سے زیادہ امید بندھتی تو یہ کہ پھانسی نہ ہوگی۔ لیکن کالا پانی کی سزا تو ضرور ہی ملے گی۔ وہ سوچنے لگتا۔ اُف سب لوگوں سے دور اور اتنی دور کہ نہ مجھے گھر والوں کی خبر ہوگی اور نہ گھر والوں کو میری ——— سوچا اس سے بہتر ہے کہ پھانسی ہی ملے۔ ایک مرتبہ چھٹی مل جائے موت سے بدتر زندگی گذارنے کا کیا فائدہ۔ بوڑھی اور اندھی ماں کا کون خیال کریگا۔ بیوی جس کی پہلی اور آخری امید میری ذات سے بندھی ہے۔ اُسے کون سہارا دیگا۔ اور جوان بیٹی ——— آہ اسے اب کون بیاہے گا۔ اسی کے بیاہ کے لئے تو یہ سب کچھ ہوا۔ یہ سب خیال کرکے اس کے دل اور دماغ میں کھلبلی سی مچ گئی۔ اور وہ کچھ سمجھے بغیر تیزی سے چلنے لگا۔ زنجیر زور سے کھڑکھڑائی۔ باہر سے وارڈر نے آواز دی۔

"قیدی!"

"ہاں بھائی"

"ابھی تک سوئے نہیں تم" وارڈر نے پوچھا
"نیند سکھ میں آتی ہے بھائی دکھ میں کہاں —" قیدی نے جواب دیا۔
"ٹھیک کہتے ہو قیدی —" وارڈر نے کہا۔
اتنے میں کسی کے پاؤں کے چاپ کی آواز سنائی دی قیدی اور وارڈر دونوں چپ ہو گئے۔
مگر ایک ہی منٹ میں آنے والے نے کہا۔
"بھائی رام سنگھ! یہ سالے بدمعاش کہیں بھی ہوں بھلے مانسوں کو چین نہیں لینے دیتے جب چھٹے رہتے ہیں۔ تو لوگ ان کے ڈر سے پوری نیند نہیں سوتے اور جب پکڑ کر جیل میں آتے ہیں تو ہم لوگوں کی جان کھاتے ہیں۔ ساری رات کتوں کی طرح اِدھر اُدھر پھر کر پہرہ دینا پڑتا ہے۔ ہم راجہ ہوتے بھائی رام سنگھ تو سب سالوں کو چن چن کر مار ڈالتے۔"
"بھلے ہی راجہ نہ ہوئے" رام سنگھ بولا۔ "مگر یار تم راجہ ہوتے تو ایسا کہتے بھی نہیں۔ آج بھی راجہ ہے کوئی مگر وہ ختم کیوں نہیں کرتا؟ تم بھی راجہ ہوتے تو ایسے ہی بے فکر ہوتے —"
نہیں بھائی رام سنگھ تمہارے سمجھنے کا پھیر ہے۔ بیچارہ راجہ تو سات سمندر پار ہے اُسے ہماری خبر کب ہوتی ہے اس نے ہماری دیکھ بھال کے لئے سینکڑوں افسر رکھ دیئے ہیں۔"
"تب بھیا تیجا سنگھ" رام سنگھ بولا۔ "یہ افسر ایسا کیوں نہیں کرتے۔"
"اپنے موج سے کب چھٹی ملتی ہے، جو پرجا کو کوئی دیکھے ہم ہوتے تو بتا دیتے۔"
تیجا سنگھ نے اس انداز میں جواب دیا جیسے اب اُس کی اِس بات کا کسی کے پاس جواب ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر سر اٹھا کر اس انداز سے رام سنگھ کو اُس نے دیکھا جس کا مطلب یہ تھا کہ

"تم بدھو ہو۔ ساری باتیں ہیں جانتوں۔ رام سنگھ بھی اس کی اس بات کا جواب نہ دے سکا۔ وہ تیجا سنگھ کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ اُسے تیجا سنگھ کی بات دل کو لگتی معلوم ہوتی۔ مگر اُس نے ذرا ہنستے ہوئے کہا۔

"چھوڑ بھیا اس بات کو۔ ۔ ۔ ۔ اگر یہ چور اچکے نہ ہوتے تو ہم لوگ کا پیٹ کہاں سے بھرتا؟"

تیجا سنگھ کو رام سنگھ کی بات ٹھیک معلوم ہوئی وہ جوش کے ساتھ بولا۔

"ٹھیک کہتا ہے یار میرے۔ بات سوا سولہ آنہ کہی۔"

رام سنگھ نے تیجا سنگھ کے اس اعتراف کو سُنکر خوشی سے مونچھیں اینٹھیں۔ جیسے اس نے کوئی بڑا کمال کر دکھایا تھا۔ وہ مونچھیں اینٹھتا ہوا بولا۔

بھیا تیجا سنگھ، سنا ہے جنانہ وارڈ میں کوئی جوان لگائی آئی ہے کیسی ہے کیسی؟ ہے کوئی رسیلی چلبلی اور رنگیلی۔ چھبّو بھائی تو بڑے مزے کے ساتھ اس کی بات کر رہے تھے۔

تیجا سنگھ نے ذرا اکڑ کر کہا۔

"ہے تو ٹھیک مزیدار، رسیلی چھبیلی ہر طرح دار ــــ جیا رہی ہے بھائی۔ چوری کر کے آئی ہے۔ چار مہینے کی سزا ملی ہے۔"

رام سنگھ نے مونچھوں پر تاؤ پھیرتے ہوئے کہا۔ "ارے بھائی ایسی جوان عورت کو چوری کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ روپیہ تو اس کے پاؤں پر برستا ہے نا۔ آخر جیا رن سالی۔"

تیجا سنگھ نے ذرا افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

"یار ہم تو اس سے بڑی دیر بات کرتے رہے۔ سب بات ہم سے بولی۔ کہتی ہے اس نے

چوری نہیں کی۔"

"تو پھر۔۔۔" رام سنگھ نے حیرت سے پوچھا تیجا سنگھ نے جواب دیا۔ مگر اور ذرا دھیمی آواز میں۔

"کہتی تھی ——— اس کا مرد زمیندار کا ہلواہا تھا۔ وہ بھی زمیندار کے گھر کام کرتی تھی۔ ایک دن زمیندار کی نیت اُس پر بُری ہو گئی۔ کام کے بہانے اُسکو کوٹھری میں لے جا کر بے عزت کرنا چاہتا تھا۔ مگر راضی نہ ہوئی۔ اور ہلا کرنے کو کہا۔ اسی پر زمیندار نے ہلا کر کے اس کو پکڑ لیا۔ اور پولس کے حوالہ کر دیا۔

رام سنگھ نے ذرا رنجیدہ ہو کر جواب دیا۔

یہ تو بڑا جلم ہے یار۔ مگر تھا سالا بڑا چالاک، بات سُننے ہی نہ دی۔ پولس کے حوالہ کر دیا۔"

تیجا سنگھ نے کہا۔

"یار ہمیں بھی اُسکی بات سنکر بڑی دیا آئی ——— ارے یار کیا اُسکی بڑائی کریں ہم۔ بالکل جوان ہے ہے تو کالی۔ پر آنکھ کیسی رسیلی ہے، بولی کیسی رس بھری ہے اور صورت ——— واہ رائے واہ ———

رام سنگھ نے ایسے انداز میں کہا۔ جیسے لالچ سے وہ مچل گیا ہو۔

"ارے یار تم نے تو آنکھوں اور دل کا مزہ لوٹ لیا۔ کیوں؟ ہو یار قسمت کے سانڈ۔"

تیجا سنگھ کی بات کا انداز بدل گیا۔ اور وہ فخر کے ساتھ بولا۔

"بس اتنا ہی اگر پانچ چھ دن میں اس کو اپنا نہ بنا لیا تو کچھ کہنا۔

تیجا سنگھ کی یہ بات سُنکر قیدی کے دل میں غصے کی ایک لہر دوڑ گئی۔ پھر اُسے کچھ ہوش نہ

رہا۔ وہ دونوں پھر کیا بولے۔ اور کیا نہ بولے وہ اندھیرے کمرے میں بند تھا ہر طرف سناٹا تھا مگر خیالوں کی دنیا میں نہ جانے کہاں کہاں سے ہو آیا۔ کیا کیا کام ختم کر لئے۔ وہ اپنی ساری مصیبتوں کو بھول گیا۔ اُس کے منہ سے نکلا ——— پاپی۔ بدمعاش !! ہم پاپیوں کے رکھوالے۔ چنڈال ——"

وہ سوچنے لگا میں نے قانون کا پاپ کیا تو اس جیل کی کوٹھڑی میں آیا۔ آگے کیا ہوگا کچھ معلوم نہیں لیکن جو لوگ یہاں پاپ کریں۔ وہ کہاں جائیں گے۔ پاپ کی سزا ملنی ضرور ہے لیکن جس پاپ کو قانون کی آنکھیں دیکھ نہ سکیں۔ انصاف کے ہاتھ پکڑ کر سزا نہ دے سکیں۔ اس کی سزا کیسے مل سکتی ہے۔ اور سزا ملنی ضرور چاہیے ......

اس نے کوشش کی کہ دونوں وارڈروں کی باتیں سنے۔ لیکن اسے کوئی آہٹ نہ معلوم ہوئی۔ وہ آ کر بچھے ہوئے کمبل پر بیٹھ گیا لیکن اسکا دماغ برابر کام کر رہا تھا۔ ایسے پاپیوں کو سزا کس طرح ملنی چاہیے۔ تیجا سنگھ کی بات اس کے دماغ میں برابر چکر کاٹ رہی تھی "بالکل جوان ہے۔ آنکھیں رسیلی ہیں یکایک وہ تیجا سنگھ کی ساری باتیں بھول گیا۔ اس کو اپنی بیوی یاد آگئی۔ بالکل جوان رسیلی آنکھوں والی اُسے اپنی بیوی کی سب سے پہلی بات یاد آگئی۔ بیاہ کے بعد ——— جب تنہائی میں پہلی بار ایک عورت سے ملا تھا۔ اُس نے کوٹھری میں چاروں طرف دیکھا بالکل سناٹا تھا۔ بالکل ایسی اکیلی وہ کوٹھری بھی تھی۔ فرق تھا تو یہ کہ اس میں چراغ کی دھیمی دھیمی روشنی تھی۔ اور یہ بالکل اندھیری۔ وہاں ذرا آرام دہ بستر تھا۔ اور یہاں سخت زمین پر کمبل کا بچھونا۔ اُسے اپنی بیوی کی پہلی بات یاد آئی جب وہ اُسے محبت سے چھیڑ رہا تھا۔ اور وہ بالکل بناوٹی غصے سے بولی تھی۔

"اوہ سو جاؤ نا، تنگ مت کرو نیند آرہی ہے۔" پھر وہ اسکے ہاتھ کو جھٹکتے ہوئے بولی تھی۔ "تمہیں نیند نہیں آتی تو جاگو ہمیں کاہے ستاتے ہو۔" اور جب کچھ دنوں کے بعد اُس نے بیوی سے پوچھا کہ سچ سچ تم رنج ہوگئی تھیں، تو اُس نے محبت کے ساتھ جواب دیا تھا "تم سے رنج ہونگی تو خوشی کہاں ملے گی۔"

اُسے معلوم ہوا جیسے کسی نے تان کر اُسی کے دل میں گھونسہ مار دیا۔ وہ تلملا سا گیا۔ اُسکی سانس پھولنے لگی۔ دم گھٹتا ہوا معلوم ہونے لگا لیکن بیوی کی ساری باتیں ایک ایک کرکے یاد آنے لگیں اُس کا بولتے بولتے مسکرانا، کھلکھلا کر ہنسنا۔ اور ہنستے ہنستے بولتے جانا ــــ محبت سے حال پوچھنا۔ اُس کی ذراسی پریشانی پر اُس کا پریشان ہوجانا ــــــــ اور بہت سی باتیں۔ اسکی بے چینی بڑھتی گئی۔ وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا اور اس اندھیری کوٹھری میں ٹہلنے لگا۔ اور زنجیریں کھڑکھڑانے لگیں۔ وہ گھبرا کر بیٹھ گیا۔

زنجیر کی کھڑکھڑاہٹ نے اس سے پہلے اس پر اتنا زیادہ اثر کبھی نہیں کیا تھا۔ بیٹھتے ہی اُسے معلوم ہوا جیسے اُسکے دل کی حرکت بند ہوتی جارہی ہے اُس نے لمبی لمبی سانس لینی شروع کی مگر پھر بھی کچھ سکون نہ ہوا۔ معلوم ہوا جیسے دم گھٹتا ہی جا رہا ہے گھبرا کر اُس نے دیوار کے اوپری حصے کو دیکھا۔ جہاں ہوا آنے کے لئے دو گول گول سوراخ بنے تھے۔ سوراخ سے روشنی ذرا بھی نہیں آرہی تھی۔ دونوں سوراخ اسکی ماں کی آنکھوں کی طرح بے نور تھے۔ اُسے ان سوراخوں کو دیکھ کر ڈر معلوم ہونے لگا۔ اُس نے گھبرا کر آنکھیں بند کرلیں۔ اُسے محسوس ہوا جیسے کوئی دوسرا آدمی کوٹھری میں چل رہا ہے۔ اُس نے آنکھیں کھول کر دیکھا پھر بند کرلیا۔ کوٹھری میں اُس کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا۔ اس سے وہ اور بھی ڈر گیا۔ وارڈر نے اسے بتایا تھا کہ اسی کوٹھری میں ایک خونی ڈاکو بند تھا جیت سنگھ اُسے آنے ہی یقین تھا کہ پھانسی ہوگی۔ لیکن

چیت سنگھ نے آتے ہی جیلر سے کہدیا تھا کہ اُسے پھانسی نہیں ہو سکتی پہلے تو اُس نے بھاگنے کی کوشش کی
مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ تو دیوار سے ٹکرا کر مر گیا۔ اور ابھی بھی چیت سنگھ کی روح اس کوٹھری میں آیا کرتی ہے
قیدی کو معلوم ہوا جیسے چیت سنگھ کی روح کوٹھری میں موجود ہے اِدھر سے اُدھر دوڑتی پھر رہی ہے گھبرا
کر اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ پاؤں کے چاپ کی ہلکی ہلکی آواز اُسکے کانوں میں آنے لگی۔ اسکا رواں رواں
سہم گیا۔ اُس نے چھت کو دیکھا۔ کمرہ بالکل اندھیرا تھا۔ دیوار کے دونوں گول گول سوراخ اُسے نظر آئے
وہ اور بھی ڈر گیا۔ چیت سنگھ کی روح اُسے وہاں سے جھانکتی معلوم ہوئی وہ دل ہی دل میں سیارام سیارام
کہنے لگا۔ ڈر کم ہوا اور وہ چیت سنگھ کی بہادری کے کارناموں کو یاد کرنے لگا۔ اُسکے دل میں خوشامد کا
ایک جذبہ پیدا ہو گیا۔ اُس نے دل ہی دل میں، لیکن اس طرح جیسے وہ چیت سنگھ کو مخاطب کر کے کہہ رہا
ہو۔ کیا چیت سنگھ۔ وہ تو بڑا شریف، دلیر اور بہادر آدمی تھا۔ اگر اُس نے ہزاروں کو لوٹا۔ تو ہزاروں کی
پرورش بھی کی۔ وہ تو شیر تھا شیر۔

وارڈر نے اُسے بتایا تھا کہ جب چیت سنگھ گرفتار ہوا تھا تو ہزاروں بیوہ عورتیں روتی چیختی
کچہری میں آگئی تھیں۔ وہ امیروں کا دشمن تھا اور غریبوں کا رکھوالا۔ مرد تھا مرد۔ انصاف ور تھا۔ امیروں
کو لوٹ کر غریبوں کو دیا کرتا تھا۔ اُسے تو انعام اور منصب ملنا چاہیئے تھا ـــ اُس نے اگر سینکڑوں خون
کئے تھے۔ تو سینکڑوں فاقہ سے تڑپتی ہوئی زندگیوں کو بچایا بھی تھا ـــ اسکا کوئی گناہ نہیں تھا۔

اُس کے دل کو سکون ہوا۔ اُس کو یقین ہو گیا کہ اگر چیت سنگھ کی روح کوٹھری میں ہو گی تو
تو خوش ہو کر چلی جائیگی۔ ڈر بالکل ہی جاتا رہا ـــ غریب لوگوں کا خیال آتے ہی اُسے اپنی ماں
بیوی اور بیٹی یاد آگئی۔ بیوی جس کی جوانی اب ڈھل چکی تھی۔ جس کی جوانی کو یاد کر کے تھوڑی دیر

پہلے وہ تڑپ گیا تھا تیجا سنگھ اور رام سنگھ کی بات یاد آئی اور وہ غصے سے بھوت ہو گیا۔ اُسے خیال آیا۔ اُسکی بیٹی جوان ہے اسی کے بیاہ کیلئے سب کچھ ہوا۔ اگر اُس کے بیاہ کی بات بیچ میں نہ ہوتی تو سنارن کا خون کیوں ہوتا ـــــ ارے کمبخت چلائی کیوں؟ چلاتی نہیں تو اس کو مار ڈالنے کی کیا ضرورت تھی۔ کمبخت کی نیند ہی کیوں ٹوٹی۔ اگر نہ جاگتی تو چپ چاپ روپیہ لیکر بھاگ آتا۔ نہ اُس کی جان جاتی اور نہ میں آج اس کوٹھری میں ہوتا ـــــــــــ

پھر وہ سوچنے لگا۔ لیکن وہ اتنا روپیہ کیوں جمع کر رکھتی تھی۔ اس سے اُس کا کیا فائدہ تھا۔ اچھا کھاتی تھی اور نہ اچھا پہنتی تھی۔ کوئی بال بچہ بھی تو نہ تھا جس کے لئے جمع کر رہی تھی۔ آخر اُسکو اتنے روپیوں کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس نے اتنا روپیہ جمع ہی کیوں کیا تھا سود در سود بڑھانے کیلئے۔

پھر وہ سوچنے لگا ـــــ اگر میں نے بڑھی سنارن کو قتل بھی کر دیا۔ تو کیا بُرا کیا۔ اس سے دنیا کا کیا بگڑ گیا۔ وہ اکیلی جان سے گئی مرنے کے بعد ایشور مجھ سے سمجھے گا۔ سزائیں دیگا۔ لیکن اگر مجھے پھانسی دی گئی۔ تو بیوی بیٹی اور بوڑھی ماں کو کون دیکھے گا ـــ بیٹی کا بیاہ کون کریگا میں نے بڑھیا سے کتنی خوشامد سے قرض مانگا تھا۔ دیدیتی تو یہ سب کچھ کیوں ہوتا۔ اس میں میرا قصور بالکل ہی نہیں سب اُسی بڑھیا کا قصور تھا۔

اُسکو اپنے بے قصور ہونیکا یقین ہونے لگا اور وہ ساری باتوں کو جتنا زیادہ سوچتا تھا۔ بے قصور معلوم ہوتا تھا۔ آخر اُسے یقین ہو گیا۔ کہ وہ ضرور رہا ہو جائیگا۔ وکیل نے بحث بھی خوب کی ہے۔ خوشی کی ایک لہر اُسکے سارے بدن میں دوڑ گئی ـــــ اُس کو معلوم ہوا جیسے وہ رہا ہو کر گھر جا رہا ہے خوشی سے اس کا دل بلیوں اچھلتا جا رہا ہے۔ لوگ راستے میں اُسے دیکھ کر کہہ رہے ہیں۔ بیچارہ

بے قصور تھا چھوٹ گیا۔ اپنے پرائے خوشی خوشی ملنے آئے ——— گھر پہنچا۔ ماں نے دوڑ کر بلائیں لیں۔ چھاتی سے لپٹا لیا۔ گال پیشانی اور ہاتھوں کو چومنے لگی۔ بیوی ذرا دور کھڑی خوشی کے آنسو بہانے لگی بیٹی اُس کے پاؤں سے آکر لپٹ کر رونے لگی۔ دنتے کی ساری عورتیں آنگن ہی میں آکر جمع ہوگئیں۔ اور اُسے دعائیں دینے لگیں۔ اور وہ ہر ایک سے خوش ہوکر مل رہا ہے۔

یکایک تیجا سنگھ اور رام سنگھ کی آواز سنائی دی۔ رام سنگھ بول رہا تھا ———

"عجیب ہے اس کی آنکھ یار ——— بولی ہے کیسی سریلی۔ مگر بڑی کٹھور معلوم ہوتی ہے"

تیجا سنگھ نے جواب دیا۔

"چڑیا نئی پھنس کر آتی ہے۔ تو زیادہ پھڑپھڑاتی ہے۔ پھر رستے پر آہی جاتی ہے پنجرے کی ہوا تو لگ جائے ———"

قیدی کا غصہ سے خون کھولنے لگا۔ اس سے ضبط نہ ہوسکا اور وہ بولتا ہوا اُٹھا۔ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔

"ٹھہر سالے چکھاتا ہوں مزا ———"

لیکن وہ دروازے سے جاکر ٹکرا گیا۔ سر میں سخت چوٹ آئی۔ وہ لڑکھڑا کر گر پڑا اور ڈول نے گھنٹی بجائی۔ جیلر کو خبر دی گئی۔ دروازہ کھلا۔ قیدی دروازے پر پڑا تھا۔ زنجیروں میں جکڑا ہوا مگر اُس کی روح آزاد تھی ———

بھوک

بھوک نے جب کروٹ لی تو آنتوں کے ساتھ ہی رامو کے دل و دماغ میں بھی ہلچل مچ گئی وہ سوچنے لگا، اب کیا کرنا چاہیے۔ بھوکے رہنے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ فاقہ کو چار شام تو ہو چکے صبح ہو گی تو پانچواں ہوگا۔ تین دن سے کام ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔ لیکن کام نہیں ملتا۔ اب صبح ہوتے ہی کام کہاں سے مل جائیگا اور اگر کام ملا بھی تو کس کے بدن میں اتنا بوتا ہے جو کر سکے، کام ہوگا کیسے؟ وہ بھوک سے تلملا رہا تھا۔ اُس کے دماغ میں صرف ایک بات تھی "کھانا کہاں سے ملیگا؟" اُس کے دل میں صرف ایک خواہش تھی، کچھ بھی ہو مگر بھر پیٹ کھانا ملے۔ اُس نے سوچا اگر صبح بھی کوئی کام نہ ملا، تو وہ کہیں سے کوئی چیز اٹھا کر بھی کھا لیگا۔ یا بھیک ہی مانگ کر مل جائے یا میونسپلٹی کے ٹین ہی کے اندر ملے ——— مگر یکایک اُس کے دل میں امید کی روشنی پھیل گئی۔ اُسے یقین

ہو گیا کہ کل اُسے کوئی کام ضرور ہی مل جائیگا۔ اُس خیال کے آتے ہی معلوم ہوا کہ جیسے اُس کے بدن میں کھوئی ہوئی طاقت واپس آ رہی ہے۔ وہ دوسرے دن کے بارے میں سوچنے لگا۔ سورج نکلنے کے پہلے ہی وہ ہاٹ جائیگا۔ وہاں بہت سی عورتیں ترکاریاں خریدنے آتی ہیں۔ اُن میں سے کوئی نہ کوئی اپنا بوجھ پہنچانے کے لئے ضرور ہی کہے گا۔ پھر وہاں سے مارکٹ جائیگا وہاں بہت سے بابو لوگ اور میم صاحب پھل یا ترکاریاں خریدنے آتے ہیں۔ اُن سے کچھ مزدوری مل جائے گی' یا اور کوئی دوسرا کام۔ کچھ ہی کیوں نہ ہو مگر اُس کو کوئی کام ضرور ہی مل جائے گا اور اتنی مزدوری بھی مل جائے گی جس سے پیٹ بھر کھانا کھا سکے گا۔ اِس خیال ہی سے وہ خوش ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ جیسے اُس کا پیٹ بھر گیا اُس نے دل ہی دل میں کہا۔" ایشور بڑا انصاف ور ہے۔ وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا پھر میں بھوکا کیوں رہوں گا ؟

تھوڑی ہی دیر میں اُس کی بھوک پھر جاگ اُٹھی۔ اور وہ تلملا گیا۔ دوسرے دِن کے بارہ میں اُس کی جتنی امیدیں بندھی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ ٹوٹنے لگیں جیسے نیند ٹوٹنے کے بعد خواب فراموش ہونے لگتا ہے وہ سوچنے لگا روز ہی اِسی طرح امید بندھتی ہے مگر پوری کبھی نہیں ہوتی۔ دِن بھر پائیپ سے پانی پی کر پیٹ کی آگ بجھانی پڑتی ہے۔ لیکن آخر کیا کیا جائے اس روز روز کے اُپاس سے چھٹکارا کیسے ملے ؟ میں نے پرماتما کا کون سا اتنا بڑا قصور کیا ہے جو یہ سزا ہے۔ دنیا میں سب ہی آدمی کچھ نہ کچھ گناہ کرتے ہیں۔ لیکن سب تو بھوکے نہیں مجھی پر یہ عذاب کیوں ؟ گناہ تو سبھی آدمی کرتے ہیں۔ مگر کسی کو تکلیف اور کسی کو آرام دہ کیوں دیتا ہے ؟ مگر اس کا دماغ اُلجھ کر رہ گیا اُس نے دل ہی دل میں کہا۔" ایشور بڑا

انصاف ور ہے، وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ باقی دنیا میں آدمی تو ہر طرح کے ہوتے ہی ہیں۔ یہی تو دنیا کی سوبھا ہے ـــــ مگر اُس کی سمجھ میں کوئی بات نہ آئی۔ اُس نے دل ہی دل میں کہا۔ نراس ہونے کی کوئی وجہ نہیں، صبح ہوگی تو دیکھا جائے گا۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور پانی کے نل کی طرف بڑھا کہ چل کر پانی پیئے۔ مگر جب نل کے پاس پہنچا تو معلوم ہوا کہ

پانی آنا بند ہو چکا ہے۔ اُس کا جی سن سے ہو گیا، سر چکرا گیا

وہ نل کو پکڑے کھڑا رہا۔

آخر وہ تھوڑی دیر کے بعد سر جھکائے اور کچھ سوچتا ہوا نل کو چھوڑ کر ہٹا۔ اُس کا ہر قدم ڈھیلا پڑ رہا تھا مگر دماغ میں ہلچل تھی شاید اُس کے دل میں ایسی ہلچل پہلے کبھی نہ مچی ہوگی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اُس کی مصیبت سے کس طرح نجات ہو؟ فٹ پاتھ پر سونے سے کس طرح چھٹکارا پائے۔ اُس نے دل ہی دل میں فیصلے کے طور پر کہا۔ اب اس زندگی سے نکلنا ضرور ہے اور . . . .

. . . . کل ہی صبح اُٹھ کر زندگی بالکل بدلی ہوئی ہوگی۔ وہ یہی باتیں سوچتا اور اپنے آپ کو سمجھاتا آگے بڑھتا گیا ـــــ اُس کا ارادہ پکا ہو چکا۔ اُس نے یہاں تک سوچ لیا کہ اگر کل بھی اُسے بھوکا رہنا پڑے تو پھر وہ "جے ماں" کہہ کر گنگا میں کود پڑے گا۔ اس فیصلے کے بعد وہ سوچنے لگا کہ ترکیب کیا کی جائے؟ نوکری ـــــ نوکری کہاں ملتی ہے، مزدوری ـــــ مزدوری تو مہینوں ہی ڈھونڈتا پھرتا ہے پھر ـــــ؟؟

اُس نے بہت سی باتیں سوچ لیں، بہت سی ترکیبیں اُس کے دماغ میں ایک ہی وقت آگئیں جیسے زمین پر دانہ دیکھ کر کبوتر اُتر پڑتے ہیں۔ مگر پھر ایک ہی بار سب کی سب غائب بھی

ہوگئیں۔ صرف ایک ترکیب اُس کے دماغ میں جم کر رہ گئی اور یہی آخری ترکیب بھی خوشی سے نہیں بالکل مجبور ہوکر دیر تک وہ ایک عجیب عالم میں رہا۔ دل کہتا یہ بڑی بُری بات ہے۔ اس دنیا میں سزا، بدنامی اور مرنے پر بھی سزا۔ دماغ کا جواب ہوتا۔ ہزار بُرا سہی مگر اب اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں۔ آخر دل کی ہار ہوئی۔ دماغ جیت گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ چوری کرے گا ــــــ

پھر دل و دماغ میں کھینچ تان شروع ہوئی۔ مگر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ چوری کر کے اگر بچ نکلا تو کچھ دنوں کھانے اور رہنے کا بھی سامان ہو جائے گا، اور اگر پکڑا گیا تو بھی گھاٹے میں نہیں رہے گا۔ پولس کے پٹر تھپیڑ کے بعد کھانے کو مل ہی جائے گا۔ رہنے کو حوالات۔ پھر جیل کی کوٹھری، کمبل اور کپڑے، واہ سب کچھ مل جائیگا۔ وہ مسکرا دیا، مگر دل نے پھر ایک بار کروٹ لی اور اُس نے آپ ہی آپ سوال کرنا اور جواب دینا شروع کیا۔ ٹھیک ہے کھانا تو مل ہی جائیگا مگر پکڑا گیا تو بڑی بے عزتی ہوگی اور جیل گیا تو پھر واپس آکر لوگوں کو کیا منہ دکھائے گا؟ مگر آج چوری نہ کرنے پر کون بڑی عزت ہے۔ جس میں بٹہ لگ جائے۔ جیل میں یہ شہر، یہ بازار کہاں؟ مگر باہر رہ کر تو اس کا بھی موقعہ نہیں ــــــ کچھ بھی ہو کسی طرح سہی، لیکن وہاں پیٹ بھر کھانا تو ملے گا اس کا ارادہ اور بھی مضبوط ہوگیا۔

وہ چوری کرنے کا پکا ارادہ کر چکا تھا۔ اور بدن میں طاقت بھی محسوس کرنے لگا۔ وہ بھوک کو بالکل بھول گیا اسے ذرا بھی احساس نہ رہا کہ وہ کس حال میں تھا۔ اُس کی نگاہوں میں روپیوں کا ڈھیر تھا۔ کانوں میں روپیوں کی کھنک گونج رہی تھی۔ وہ تیزی کے ساتھ قدم بڑھانے لگا اور بغیر کسی ارادہ کے ایک طرف تیزی سے چلنے لگا۔ اُس کے دماغ سے تھوڑی دیر کے لئے چوری

کرنے کا خیال بھی نکل گیا۔ اور شیخ چلی کی طرح خیالی قلعے بنانے لگا۔ چوری کرنے کے بعد وہ
مالدار آدمی ہو جائے گا۔ بوڑھی ماں کو آرام پہنچائے گا۔ اسی چوری کے روپے سے وہ کاروبار
شروع کرے گا۔ اور لوگ اُسے اچھی نظر سے دیکھنے لگیں گے۔ پھر بیاہ کرے گا۔ اچھی سی عورت
مل جائے گی۔ اب تک صرف غریبی کی وجہ سے اس کا بیاہ نہیں ہو سکا۔ جب روپیہ ہو گا۔
تو پچیسوں آدمی بیٹی دینے کو تیار ہو جائیں گے۔ بیاہ کے خیال سے رامو کو بڑی خوشی ہوئی
وہ طرح طرح کی باتیں سوچنے لگا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک خوبصورت عورت کی تصویر
پھر گئی۔ جسے شام کے وقت اُس نے موٹر میں جاتے دیکھا تھا۔ وہ اپنی ہونے والی بیوی کو
اُس عورت سے کم خوبصورت نہ چاہتا تھا۔ سوچنے لگا وہ کام کر کے واپس جائے گا تھکا ماندہ
عورت ضد کر کے اچھی اچھی چیزیں کھلائے گی۔ کھانے کا تصور آتے ہی سارا خیالی قلعہ چکنا چور
ہو گیا۔ آنتیں اینٹھنے لگیں۔ اور وہ بے چین ہو گیا۔ وہ چوری کے فیصلے کو بھول چکا تھا۔ پھر
وہ ارادے کو مضبوط کرنے لگا۔ اب اُس کے حوصلے میں نئی طاقت تھی۔ اُس نے چاروں
طرف نظر گھما کر دیکھا ہر طرف اونچے اونچے مکانات تھے اور بجلی کی تیز روشنی ——— کسی
مکان میں گھسنے کا موقعہ ہی نہ تھا۔ پھر وہ سوچنے لگا کہ آخر چوری کہاں کی جائے؟ ———

کچھ دیر سوچنے کے بعد اُسے خیال آیا۔ شہر کے آخری حصے میں چھوٹے چھوٹے بنگلے ہیں۔ چار
دیواری بھی نیچی ہے۔ سڑک پر دونوں طرف گھنے پیڑ بھی ہیں۔ وہاں آسانی کے ساتھ چوری
کی جا سکتی ہے۔ وہاں کافی اندھیرا رہتا ہے۔

خوب اچھی طرح سوچنے کے بعد وہ اُسی طرف چلا، دور سے گھنٹہ گھر سے ٹن ٹن دو بجنے

کی آواز آئی - اُس نے دل ہی دل میں کہا . وقت بھی اچھا ہے ——— اب وہ تیزی کے ساتھ قدم بڑھا رہا تھا ——— مگر یکایک اُس کو خیال آیا - ان بنگلوں میں کتے پلے ہوئے ہیں ——— یہ خیال آتے ہی وہ سہم گیا . ہمت ٹوٹ گئی - اس کو یقین ہو گیا کہ بنگلے کے اندر قدم رکھتے ہی کتے اُسے نوچ ڈالیں گے ——— اس کا ارادہ ڈانوڈا ل ہو گیا -

بھوک نے پھر کروٹ لی اور وہ سوچنے لگا سب سے پہلے اُسے کچھ کھانے کو ملنا چاہئے اگر بنگلے میں گیا بھی تو اُس وقت کچھ کھانے کو مل نہیں سکتا . بابو لوگوں کے یہاں اننت کہاں بکتا ہے کہ باسی رہے بنگلوں میں اُس وقت کھانے کی کوئی چیز نہیں مل سکتی . سب کچھ ختم ہو چکا ہو گا - وہ سوچنے لگا کہ اس وقت کھانے کی چیز کہاں مل سکتی ہے . آخر اُس کے دماغ میں بات آگئی کہ اس وقت کھانے کی کوئی چیز صرف حلوائی کی دوکان میں مل سکتی ہے یہ خیال آتے ہی معلوم ہؤا کہ جیسے اُسے سب کچھ مل گیا . پھر وہ سوچنے لگا . کہ چوری کرنے کے لئے حلوائی کی کون سی دوکان مناسب ہے .

تھوڑی دیر سوچنے کے بعد اُسے ایک حلوائی کی دوکان یاد آئی . یہ دوکان شہر کے آخری حصّے میں تھی . وہاں پر کی آبادی بھی کم تھی . رامو کو چوری کرنے کی یہ جگہ طرح طرح مناسب معلوم ہوئی . وہ اُسی طرف چلا . اب وہ سوچ رہا تھا . کس طرح دبے پاؤں دوکان میں گھسے گا ، کس طرح الماری کھولے گا ؟ کس طرح کھانے کی چیزوں پر ہاتھ مارے گا اور کس طرح روپیہ نکالے گا ؟ مگر وہ کبھی کبھی ڈر کر چونک سا جاتا تھا . اس کو خیال ہوتا تھا . کہ شاید

چوری نہ کر سکے۔ یا پکڑ لیا جائے۔ مگر چوری کرنے کا وہ پکا ارادہ کر چکا تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا
کاش اُسے کوئی منتر معلوم ہوتا، یا مسان کی راکھ مل جاتی کہ تھوڑی دیر کے لئے جسے
چاہتا بے ہوش کر دیتا۔ پھر وہ اطمینان کے ساتھ جاتے ہی منتر پڑھتا یا مسان کی راکھ کو
سوئے ہوئے آدمیوں پر چھڑک کر اطمینان سے چوری کر لیتا۔ اُسے ایک پل کے لئے ایسا
معلوم ہوا جیسے اُسے سب کچھ آتا ہے۔ اور اُس نے حلوائی کو بے ہوش بھی کر لیا ہے۔ مگر اُس
کا یہ خیال فوراً ہی مٹ گیا۔ پھر اُس نے سوچا کہ کبھی کسی چور سے مل کر وہ ضرور پوچھے گا، مگر
تھوڑی دور جا کر اُس کا خیال یکایک اُچٹ گیا۔ دو کُتے اُسے دیکھ کر بھونکنے لگے، اُس نے
سوچا کتے چور کو دیکھ کر بھونکتے ہیں۔ یہ سچ ہے —— چار قدم پر آگے چل کر بجلی کا
کھمبا تھا۔ سڑک پر کی روشنی جل رہی تھی، چار پانچ آدمی فٹ پاتھ پر ٹاٹ بچھائے تاش
کھیل رہے تھے۔ رامو اُن لوگوں کے پاس سے ہو کر گزرا۔ لیکن کسی نے دھیان نہیں دیا۔ ایک
آدمی جلدی جلدی اپنے پتوں کو دیکھ رہا تھا۔ دوسرا آدمی ٹاٹ پر پڑے ہوئے پتوں کو۔
تیسرا سر اور انگلی ہلا ہلا کر کچھ سوچ رہا تھا۔ چوتھا اس شان سے جیسے سب کو اُس نے ایک
چال میں مات دیدی ہے ایک اور آدمی کسی دوسرے کے پتوں کو دیکھ رہا تھا۔

ایک نے بیڑی جلائی، اور لمبا دم لگایا۔ دوسرے نے پان کی لمبی پیک پاس ہی
پھینک کر کہا۔

"یہ بازی ہماری ہے چھٹو بھیّا"

چھوٹے نے جواب دیا۔ "دیکھا جائے گا"

رامو اور آگے بڑھا۔ تھوڑی دور پر ایک آدمی فٹ پاتھ پر بیٹھا گا رہا تھا

"مرے دل کی لگی تو بجھی ہی نہیں۔ ارے ہاں ہاں رے۔ ارے ہاں ہاں رے" ——— رامو جب پاس پہنچا تو اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ رامو ڈر گیا مگر وہ پھر گانے لگا ——— "تری آنکھ میں مدھرا بھری ہے مگر۔ مرے دل کی لگی تو بجھی ہی نہیں۔ ارے ہاں ہاں ———"

پُروائی تیزی سے چل رہی تھی جیٹھ کا مہینہ تھا۔ رامو کا دل بھی گانے کو چاہا۔ اُس نے گانا چاہا ——— "جانی جو بنا پہ نہ ——— مگر وہ نہیں گا سکا۔ کچھ گنگنا کر رہ گیا حلق سوکھا تھا۔ آواز نکل ہی نہ سکی۔ اُسے معلوم ہوا جیسے کلیجے میں طاقت ہی نہیں۔ اُس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اور گلا صاف کر کے کھنکھارتا ہوا آگے بڑھا۔ یکایک اُسے کسی چیز سے ٹھوکر لگی۔ وہ گرتے گرتے بچا۔ ساتھ ہی دوسرا آدمی اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ غریب فٹ پاتھ پر سویا ہوا تھا۔ رامو کو اسی سے ٹھوکر لگی تھی۔ رامو نے بڑی عاجزی کے ساتھ اُس سے معافی مانگ لی۔ دونوں نے ایک دوسرے سے پوچھا "تم کون ہو" ؟ اور میل جول ہو گیا۔ اُس نے رامو کو اپنے ٹاٹ پر بٹھا لیا اور بیڑی پینے کو دی۔ رامو کا دل بھی چاہ گیا۔ اُس نے بیڑی پی۔ مگر سر چکرا گیا۔ اُس نے بیڑی پھینک دی اور سر تھام کر بیٹھ گیا۔ دیر تک وہیں بیٹھا رہا اُٹھنے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔

جب اُس کی طبیعت سنبھلی تو وہ پھر آگے بڑھا جلوائی کی دوکان اب بھی اُس کی نگاہوں میں پھر رہی تھی۔ اُس کا دل چاہا کہ امرتی اور بیسن کا لڈو کھائے اِس خیال کے

آتے ہی اُس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اب وہ ایک تین منزلہ مکان کے پاس سے ہو کر گزر رہا تھا۔ یکایک کسی نے اُس پر مکان پر سے تیز روشنی ڈالی۔ اُس نے نظر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ مکان کی دوسری منزل پر ایک کھڑکی سے دو آدمی نیچے دیکھ رہے تھے، کمرے میں بجلی کی روشنی تھی۔ اُن دونوں پر بھی روشنی پڑ رہی تھی۔ لیکن چہرہ نظر نہیں آر ہا تھا۔ مگر رامو نے اتنا سمجھ لیا کہ ان میں ایک مرد تھا اور ایک عورت تھی۔

عورت بولی۔ "کوئی غریب آدمی ہے، چور نہیں ہے۔"

مرد بولا۔ "تمہارا خیال ٹھیک ہے۔"

رامو آگے بڑھتا گیا۔ عورت نہ جانے کسی بات پر ہنسی۔ رامو سمجھا کہ وہ اُس پر ہنس رہی ہے۔ اُس کے دل پر چوٹ لگی۔ اُس نے دل ہی دل میں کہا۔ "اگر میرے پاس بھی دو منزلہ مکان ہوتا، روپیہ اور عورت ہوتی تو زندگی مزے سے کٹتی۔ کوئی مجھ پر ہنستا بھی نہیں"۔ اس کا دل مچل کر رہ گیا۔ وہ اور آگے بڑھا۔ کچھ دور آگے جا کر ایک اندھیری گلی سے دو چار آدمیوں کی کانا پھوسی کی آواز آئی۔ وہ رُک گیا۔ لیکن اُس کے رُکتے ہی آواز آنی بند ہو گئی۔ رامو بغیر کچھ سوچے سمجھے آگے بڑھ گیا۔ اور اس راستہ پر ہو لیا جو حلوائی کی دوکان کی طرف جاتا تھا۔

تھوڑی دور جا کر وہ ایک نکڑ سے جیسے ہی مڑا ایک موٹر کھڑی نظر آئی۔ ایک بابو صاحب موٹر کو دھکا دے رہے تھے۔ اور ایک عورت کھڑی تھی۔ رامو بھوک سے نڈھال تھا۔ اُس کا ایک ایک قدم رُک رُک کر اُٹھ رہا تھا۔ وہ جیسے ہی قریب پہنچا، بابو صاحب

بولے۔

"اے سنو۔ تم پیچھے سے موٹر کو دھکا دو۔ ہم تم کو انعام دیگا۔"

رامو نے اُس عورت کو دیکھا۔ دیکھتے ہی اُسے خیال آیا کہ اس عورت کو پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہے۔ وہ سوچنے لگا کہ آخر اُسے کہاں دیکھا ہے؟

بابو صاحب بولے "اے! استا نہیں ہے۔ تم موٹر کو دھکا دو۔ ہم انعام دیگا۔"

رامو نے انعام کا لفظ سنا تو اُس کے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اور اُس کے منہ سے نکل گیا:۔

"کتنا؟"

"حرامزادہ سوٗر ——— دو روپیہ لے گا۔"

رامو کا خون کھول گیا۔ جی چاہا کہ جو بھی ہو۔ مگر ان کی ساری بابوائی نکال دے۔ مگر غم کھا کر رہ گیا۔ انعام کے لالچ میں موٹر کو دھکا دینے کو آگے بڑھا زور لگایا۔ مگر موٹر بڑا تھا۔ اور بدن میں طاقت کم۔ موٹر بال برابر بھی نہ سرکا، اور رامو ہانپنے لگا۔ تھک کر الگ کھڑا ہو گیا۔ بابو صاحب بولے "بس سالے! اسی پر کتنا انعام دیں گے؟"

دونوں نے ملکر دھکا دینا شروع کیا اور کچھ دور لے گئے۔ رامو کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ ان دونوں کے جانے کے بعد رامو کو یاد آیا۔ گاؤں کے زمیندار نے بیٹے کے بیاہ میں اس عورت کو بلایا تھا۔ وہ گانے کے لئے گئی تھی . . . .

. . . . رامو کو اُس وقت کی شیخی پر غصّہ

آیا اور بولا۔ پیتر یا سالی؟ تھوڑی دیر میں موٹر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

رامو پھر آگے بڑھا چلتا گیا۔ آخر اُس حلوائی کی دوکان پر پہنچا جس کو اُس نے تاکا تھا ——— دوکان بند تھی۔ حلوائی دوکان کے سامنے ایک لمبے بنچ پر چاروں شانے چت پڑا تھا۔ اُس کا ہاتھ زمین سے چھو رہا تھا۔ پروائی تیزی سے چل رہی تھی۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ حلوائی کے حلق سے خراٹے کی ہلکی ہلکی آواز نکل رہی تھی ———

رامو کی ہمت ٹوٹ گئی، اس کا ارادہ بدل گیا، اُس نے سوچا چوری کرنا بُرا کام ہے چاہے کیسے ہی مجبوری کیوں نہ ہو۔ اُس سے بہتر تو یہ ہے کہ حلوائی کو اٹھا کر اُس سے کچھ مانگ لیا جائے۔ یہ بھی معمولی آدمی ہے۔ کوئی بڑا آدمی نہیں ہے جو دھتکار دے گا ——— اُٹھا کر مانگنے سے کچھ دیدیگا ——— مگر کہیں چوری کی اور جاگ گیا تو پھر خیریت نہیں۔

یہ سوچ کر رامو حلوائی کے پاس گیا، چاہتا تھا کہ اٹھائے۔ حلوائی کے منہ سے بھک سے دیسی شراب کی بو آئی۔ رامو سمجھ گیا کہ یہ نشے میں چور ہے۔ اگر اس حال میں اٹھائے گا تو وہ ضرور خفا ہوگا۔ تعجب نہیں کہ مارپیٹ بھی کرے ——— پھر اُسکو چوری کرنے کا خیال ہوا اب حلوائی کی طرف سے اُس کو اطمینان تھا۔ اس کو یقین تھا کہ اُس کو چوری کی خبر بھی نہ ہوگی۔ نشے میں اَنٹا چِت ہے۔

رامو ہمت کر کے دوکان کے اوپر چڑھ گیا۔ ایک دو بار وہ اُس دوکان پر بیٹھ کر کچھ کھا بھی چکا تھا۔ اُسے ہلکا سا اندازہ بھی تھا۔ کہ کون سی چیز کہاں دھری ہے اس لیے ہر طرف اندھیرا ہونے پر بھی الماری تک پہنچ گیا۔ اُس نے جیسے ہی الماری کو

ہاتھ لگایا کھٹ سے آواز پیدا ہوئی اِس کے ساتھ ہی اندر کا کواڑ کھلا اور دھیمی آواز آئی ۔

"دروازہ اِدھر ہے جگن !"

رامو کے سارے بدن کا خون سوکھ گیا۔ وہ بالکل چپ کھڑا رہ گیا تھا۔ ویسی ہی دھیمی آواز پھر آئی ۔

"جگن تمہاری عادت بہت خراب ہے اتنی دیر کر دیتے ہو۔ دو بجے بہت دیر ہوئی اور تم بھٹی سے اب آرہے ہو ۔"

مگر رامو ہلا تک نہیں ۔ ڈر سے سارے بدن میں کپکپی پھیل گئی ۔ پھر وہی دھیمی آواز آئی ۔

"ارے آتے کیوں نہیں ۔ اب ہم تم کو پیسہ نہیں دیں گے ۔"

اتنا کہہ کر ایک عورت دروازے سے نکل آئی ۔ اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے کی طرف بڑھتی ہوئی بولی ۔

"اب تم بہت راہ دکھاتے ہو ۔"

رامو کے دماغ میں ساری باتیں آگئیں وہ سمجھ گیا کہ عورت کسی کے انتظار میں تھی ـــــ اور اسے دھوکہ ہوا ہے ـــــ وہ بوڑھا حلوائی اور یہ کڑیل جوان عورت !! تو نڈیل کیسا بے پروا پاؤں پھیلائے پڑا ہے ۔ وہ کمرے میں چلا تو گیا ۔ مگر ڈر رہا تھا ۔ کہ کہیں پہچان نہ لے ۔ عورت اُسے کمرے میں لے جا کر ایک پلنگ پر بٹھاتی

ہوئی بولی۔

"اب تم کو پیسہ نہیں دیں گے جگن! تم پی کر پگلے ہو جاتے ہو۔"

اتنا کہہ کر اُس نے رامو کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ اور پیار سے اُسے اپنی طرف کھینچا۔ رامو نے اُس کی محبت کا جواب ایک چپ میں دیا۔"

عورت نے رامو کے مونڈھے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔

"پیسہ کم تھا اس لئے خفا ہو؟ جانتے بھی ہو ہمیں زیادہ پیسہ نہیں ملتا۔"

رامو بہت سی باتیں سمجھ گیا۔ بوڑھا کنجوس بھی ہے۔ گھر میں روشنی بھی نہ تھی۔ وہ خوش تھا بوڑھے کی کنجوسی اس کے لئے فائدے کی بات ثابت ہوئی۔ رامو نے سوچا آج تو خوب جا تر ابنا۔ کھانے کو تو ملے گا ہی۔

عورت بھی" بھاؤ میں ملی ——— عورت کا خیال آتے ہی اُس کے سارے بدن میں سنسنی پھیل گئی۔ دل گدگدانے لگا۔ مگر اُس کا دل الماری میں لگا ہوا تھا بھوک نے بہت جلد ہی اُس کے خیالات کو دوسری طرف لگا دیا۔ وہ اندھیرے میں آنکھ پھاڑ پھاڑ کر کمرے میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔ کہیں کھانے کی کوئی چیز تو رکھی نہیں ہے مگر اندھیرے میں کچھ بھی نظر نہ آیا ——— عورت نے سمجھا۔ کہ وہ نشے میں ہے۔ بولی:۔

اِسی لئے زیادہ پیتے ہو۔ ہزار بار منع کیا تم مانتے ہی نہیں آؤ۔"

اتنا کہہ کر عورت نے پھر رامو کو اپنی طرف کھینچا۔ رامو نے مزے میں آکر اپنا سر اُسکی

گود میں ڈال دیا۔ اِس میں اُس کو بڑا مزہ آیا۔ سارے بدن میں گدگدی سی ہونے لگی۔ سانس زور زور سے چلنے لگی۔ اور عورت کی سانس کی گرمی اُسے اپنے گالوں پر محسوس ہوئی۔ اس گرمی میں لطف بہت زیادہ تھا۔ اُس کا دل چاہا کہ عورت کو کھینچ کر اپنی گودی میں لے لے۔ مگر وہ اُسی طرح اُس کی گود میں پڑا رہا ــــــ آخر وہ عورت اُس پر جھکنے لگی۔ رامو نے اُٹھ کر اس کو اپنی گودی میں کھینچ لیا۔ عورت اُس کی گودی میں تھی۔ اُس کا بدن بالکل ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ اُس نے اپنا ڈھیلا ڈھیلا ہاتھ رامو کی گردن میں ڈال دیا۔ رامو کا دل مچل گیا۔ اُس نے چاہا کہ اُس کو اُسی طرح لیے ہوئے سو جائے۔ مگر بھوک نے پیٹ میں مچل کر اُسے بے چین کر دیا۔ آنتیں اینٹھنے لگیں۔ بھوک نے سارا مزہ کرکرا کر دیا۔ وہ عورت کو چھوڑنا نہ چاہتا تھا۔ مگر یہ بھی چاہتا کہ پہلے کچھ کھانے کو مل جائے۔ وہ عورت کو پلنگ پر چھوڑ کر دیوانوں کی طرح اُٹھ کھڑا ہوا! عورت بولی۔

"آج تم بالکل بدلے ہوئے معلوم ہوتے ہو جگن!"

مگر رامو کچھ نہ بولا، بھوک سے بدحواس دیوار کے چاروں طرف ٹٹولنے لگا۔ شاید طاق پر کھانے کی کوئی چیز مل جائے۔ ایک تھالی میں لڈو دھرے ملے۔ اُس نے اُٹھا کر کھانا شروع کیا۔ ایک، دو۔

عورت یکایک اُٹھ کھڑی ہوئی۔ تھالی اُس سے چھین کر الگ رکھ دی اور بولی۔

"جانتے ہو جگن! لڈو وہ گن کر رکھتے ہیں۔"

رامو کو پھر وہ پلنگ پر بٹھا کر پیار سے اس کی طرف بڑھی۔ مگر دو لڈو پیٹ میں پڑ چکے تھے۔ سوئی ہوئی بھوک جاگ چکی تھی۔ اُس نے عورت پر ذرا دھیان نہ دیا۔ وہ پھر لڈو کی تھالی کی طرف بڑھا۔ دو لڈو اُس کے اور بھی ہاتھ آئے۔ عورت تھالی لیکر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ رامو کو بڑا غصہ آیا۔ اُس کا جی چاہا کہ اُسے قتل ہی کر دے۔ مگر وہ لڈو کھانے لگا۔ یکایک اُس کو کچھ خیال آیا۔ اور وہ اِدھر اُدھر ٹٹولنے لگا۔ ایک کونہ میں پانی کا بھرا لوٹا رکھا۔ اُس نے اٹھا کر پینا شروع کیا اتنے میں عورت واپس آئی اور دوسری تھالی لے کر چلی۔ رامو نے جھپٹ کر تھالی پر ہاتھ مارا عورت بولی۔

"ارے نکل دس ہیں۔ مت لو"

عورت نے پلٹ کر اُسے چھیننا چاہا۔ لیکن رامو نے اُسے زور کا دھکا دیا اور کمرے سے نکل کر بھاگ گیا۔

نیا افسانوی ادب

نئے زاویے	(مرتبہ) کرشن چندر	۳/۸/-
منٹو کے افسانے	سعادت حسن منٹو	۳/-/-
رنگ و بو	فیاض محمود	۲/۴/-
منظر و پس منظر	اختر اورینوی	۲/-/-
گرہن	راجندر سنگھ بیدی	۲/-/-
کونپل	اُپندر ناتھ اشک	۱/۸/-
باسی پھول	علی عباس حسینی	۲/-/-
رفیق تنہائی	علی عباس حسینی	۲/۴/-
ٹوٹے ہوئے تارے	کرشن چندر	۱/۸/-
طلسم خیال	کرشن چندر	۱/۸/-
بگولے	احمد ندیم قاسمی	۲/۸/-
ایک لڑکی	(خواجہ) احمد عباس	۱/۸/-
خونی	اختر انصاری	۱/۸/-
لندن کی ایک رات	سجاد ظہیر	۱/۴/-

مکتبہ اردو، لاہور

Cover Printed at The United P[illegible]na.